جلد ۱، شمارہ ۵، ذوالحجہ ۱۴۴۶، جون 2025

ماہنامہ

بصیرتِ اسلام

موضوعات

- کائنات کی وسعت اور خالقِ کائنات کی حکمت
- تعارفِ کتب: قدس کو یہودی شہر بنانے کی کوشش
- مستشرقین کا تعارف، تاریخ اور اہداف (قسط دوم)
- روحانیت، الحادیت کا رد ہے!
- خلافتِ عباسیہ (مستشرق مؤرخ ول ڈیورنٹ کی نظر میں)

MUSLIM MATURIDIAN ORGANIZATION

پیش کش : مسلم ماتریدین آرگنائزیشن

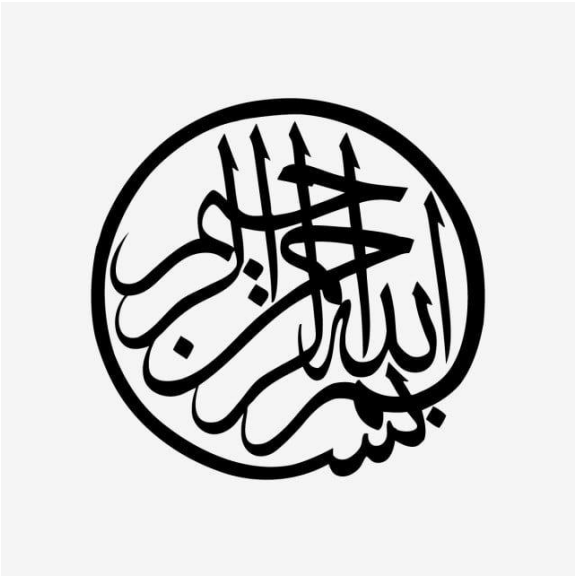

ردِالحاد، ردِلادینیت، ردِادیانِ باطلہ اور دورِ حاضر میں اسلامی نظامِ حیات کی افادیت کے حوالے سے علمی و تحقیقی مقالات سے مزین ماہنامہ

ماہنامہ بصیرتِ اسلام

INSIGHT OF ISLAM

جلد-۱/ شمارہ-۵/ذوالحجہ ۱۴۴۶ھ مطابق جون ۲۰۲۵

مدیر

محمد انور الماتریدی

پیش کش

مسلم ماتریدی آرگنائزیشن

بہ فیضانِ نظر

امام الہدیٰ امام ابو منصور الماتریدی

[پ، ۸۵۲عیسوی م، ۹۴۴عیسوی]

جملہ حقوق بہ حق مُدیر محفوظ ہیں

ماہنامہ بصیرتِ اسلام

جلد، شمارہ ۱، ۵

مدیر محمد انور الماتریدی

نائب مدیر محمد یاسر مشتاق

صفحات ۵۸

سالِ اشاعت ذوالحجہ ۱۴۴۶، جون ۲۰۲۵

سرورق حمزہ عابر

نوعیتِ اشاعت برقی اشاعت DIGITAL PUBLICATION

ناشر مسلم ماتریدین آرگنائزیشن، لاہور

مجلسِ مشاورت

۞ محمد یاسر مشتاق ۞ شہروز احمد نظامی

۞ محمد اسامہ بن صالح ۞ محمد عثمان علی کاشمیری

۞ حمزہ عابر ۞ محمد عمر اقبال

فہرست

مظاہرِ فطرت اور وجودِ باری تعالیٰ (قسط دوم)	شیخ الحدیث غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ	7
ترویجِ الحاد کے اسباب (قسط پنجم)	فیصل ریاض شاہد	17
کائنات کی وسعت اور خالقِ کائنات کی حکمت	محمد اسامہ مصطفائی	19
تعارفِ کتب: قدس کو یہودی شہر بنانے کی کوشش	محمد یاسر مشتاق	24
مستشرقین کا تعارف، تاریخ اور اہداف (قسط دوم)	محمد اشرف مجددی	36
روحانیت، الحادیت کا رد ہے!	حافظ محمد فیصل نواز	38
خلافتِ عباسیہ (مستشرق مؤرخ ول ڈیورنٹ کی نظر میں)	محمد حسن علی	42

مظاہرِ فطرت اور وجود باری تعالی (قسط دوم)

شیخ الحدیث غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ

ماں کے دودھ سے استدلال

جب ایک عورت ماں بن جاتی ہے اور اس کی گود میں بچہ کھیلنے لگتا ہے تو اس کے سینے سے دودھ اتر آتا ہے جو غذا وہ پہلے کھاتی تھی اب بھی وہی غذا کھاتی ہے نہ غذا میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے نہ کھانے والے میں کوئی تبدیلی ہوئی پھر یہ دودھ کہاں سے آگیا؟ اگر یہ غذا کا اثر تھا تو کسی اور شخص کے کھانے سے اس کے سینے میں دودھ کیوں نہیں اترتا اور اگر اس عورت کی خاصیت ہے تو بچہ کی پیدائش سے پہلے اس کے سینے سے دودھ کیوں نہیں نکالا؟ معلوم ہوا کہ یہ اثر نہ غذا کا ہے نہ غذا کھانے والی کا یہ صرف اس قادر مطلق کی کارفرمائی ہے

جو رنگ برنگ ترکاریوں کو خون کی رنگت دیتا ہے اور جب چاہتا ہے اس خون کو دودھ کی سفید دھاروں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ پھر ہمارے پاس کوئی ایسا خارجی عمل میں جس کے ذریعے ہم ماں کے سینے سے جاری ہونے والے دودھ کو روک سکیں۔ مبدا فیاض کے نزدیک جب تک بچے کو دودھ کی ضرورت ہوتی ہے وہ ماں کے سینہ میں دودھ اتارتا رہتا ہے اور جب ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو دودھ کے جاری ہونے کا یہ سلسلہ اپنے آپ ختم ہو جاتا ہے کیا انسان کے جسمانی نظام میں اللہ کی ذات اور اس کی حکمت اور قدرت کی یہ بہترین نشانیاں نہیں ہیں؟

جانوروں کے دودھ سے استدلال

جانوروں سے جو ہم دودھ حاصل کرتے ہیں یہ اس چارے سے حاصل ہوتا ہے جسے جانور کھاتے ہیں۔ پھر جب جانوروں کی اوجھڑی میں یہ چارہ پہنچتا ہے تو اوجھڑی میں ہضم اول کا مرتبہ شروع ہوتا ہے۔ اوجھڑی کے اوپر کے حصہ میں خون اور نچلے حصہ میں گوبر اور درمیانی حصہ میں دودھ کا قوام تیار ہوتا ہے اور اس قوام کو اللہ تعالی ہضم کے مختلف مراحل سے گزارتا ہوا جانوروں کے تھنوں تک پہنچا دیتا ہے۔ دودھ کے نیچے گندگی اور غلاظت ہے اور اس کے اوپر سرخ رنگ کا سیال خون دوڑ رہا ہے۔ آخر وہ کون سی حقیقت ہے جو جانوروں کے پیٹ میں تصرف کر کے سرخ رنگ کے سیال خون اور بدبودار گوبر کے درمیان سے صاف سفید شیریں اور خوشبودار دودھ کو اس

طرح باہر نکال لیتی ہے کہ نہ گوبر کا کوئی ذرہ اس میں داخل ہوتا ہے اور نہ خون کا کوئی قطرہ اس میں شامل ہوتا ہے؟ کیا یہ صاف اور پاکیزہ دودھ اس خالق کائنات کی طرف اشارہ نہیں کرتا جو فرماتا ہے: وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ ۠ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ(66) "ان جانوروں میں تمہارے لیے غور و فکر کا موقع ہے۔ ہم تم کو گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے"[1]۔

دودھ کا یہ حصول چارہ کا طبعی خاصہ نہیں ورنہ نر جانور بھی یہی چارہ کھاتے ہیں اور ان سے دودھ کا کوئی قطرہ حاصل نہیں ہوتا اور نہ یہ مادہ جانور ہی کی طبعی خصوصیت ہے ورنہ ایام حمل میں یا اس سے پہلے بھی وہ دودھ دیتی رہے۔ نہ بچہ کی خصوصیت ہے کیونکہ بچہ کے مر جانے کے بعد بھی وہ ایک مدت معینہ تک دودھ دیتی رہتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جانوروں سے دودھ کے حصول کے نظام میں چارہ جانور اور بچہ کوئی چیز مرکزی کردار ادا نہیں کرتی۔ اس تمام مربوط نظام میں جو دودھ کے حصول کا سبب ہے وہ ایک ذات کارفرما ہے جو عالم کے ذرہ ذرہ میں اپنا تصرف فرما رہی ہے۔

نظام ہضم سے استدلال

انسان جو غذا کھاتا ہے وہ اس کے معدہ میں چلی جاتی ہے اور وہاں اس کا ہضم اول شروع ہوتا ہے۔ اس غذا کا جو صاف جوہر ہے وہ جگر کی طرف چلا جاتا ہے اور جو کثیف مادہ ہے وہ انتڑیوں کی طرف چلا جاتا ہے۔ پھر جگر میں ہضم ثانی ہوتا ہے اور صاف جوہر جگر میں جا کر سوداء صفراء پانی اور خون بن جاتا ہے۔ پھر وہاں ان کی تقسیم شروع ہوتی ہے۔ صفراء پتہ کی طرف چلا جاتا ہے اور سوداء تلی کی طرف چلا جاتا ہے اور پانی گردہ کی طرف اور خون رگوں کی طرف چلا جاتا ہے اور وہاں ہضم ثالث کا عمل شروع ہوتا ہے اور حرارت غریزی سے اعضاء بدن کی جو صورت تحلیل ہوتی رہتی ہے۔ خون ان اعضاء میں پہنچ کر اس کے عوض اس عضو کی نئی صورت مہیا کرتا ہے۔ سوچئے! کیا یہ سب یونہی ہو رہا ہے؟ کھانے کے چند نوالوں سے جو خون گوشت اور ہڈیوں کی صورت نشو و نما پا رہی ہے کیا یہ کسی عظیم حکمت اور زبردست قدرت کے زیر انتظام نہیں ہے؟

---

[1] سورہ النحل:66

انسانی نشوونما سے استدلال

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے جس طرح انسان کے جسم کی ساخت بنائی ہے اس میں متعدد کارآمد اعضاء رکھے ہیں۔ پھر جو غذا ہم پانی اور کھانے کی شکل میں حاصل کرتے ہیں اس کا ایک ایک ذرہ وہ ان تمام اعضاء کو ان کی مخصوص جگہوں پر پہنچاتا ہے اور جس عضو کو جتنی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کو اتنی توانائی فراہم کرتا ہے اور اس طرح تدریجاً انسان کو اس کے طبعی ارتقاء تک پہنچاتا ہے۔ آپ سوچئے کہ انسان کے جسم میں اس سارے نظام کو کون چلا رہا ہے؟ کیا یہ نظام خود بخود چل رہا ہے؟ یہ تو ہو نہیں سکتا یا کوئی مافوق الفطرت ہستی اس نظام کو چلا رہی ہے؟ پھر وہ ہستی کیا سورج ہے چاند ہے پانی ہے آگ ہے، پتھر ہے؟ جانور ہے انسان ہے کیا ہے؟ یہ تمام چیزیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے خود کسی کے بنائے ہوئے نظام کے تحت سرگرم عمل ہیں اور اس نظام کے پابند ہیں اور اس کے احکام کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ عناصر ہوں یا کواکب زمین کی پہنائیاں ہوں یا افلاک کی بلندیاں یہ سب ایک نپے تلے مقدر اور منضبط نظام کے تحت اپنے اپنے حصہ کا کام انجام دے رہے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ جس ذات نے ان تمام موجودات کو ایک نظام میں مربوط کیا ہوا ہے وہی ذات انسانی جسم کی ساخت اور اس کی نشوونما کی خالق اور مربی ہے۔ سورج اور چاند اسی کے حکم سے طلوع ہوتے ہیں۔ دن اور رات کا سلسلہ اس کے اذن سے وجود میں آتا ہے۔ سمندروں میں طوفان اس کے حکم سے اٹھتے ہیں اس کے حکم سے بارشیں نازل ہوتی ہیں۔ اس کے اذن سے کھیتیاں ہری ہوتی ہیں وہ نہ چاہے تو بادلوں سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ اترے کھیتیاں ویران ہو جائیں اور زمین غلہ کا ایک دانہ بھی نہ اگا سکے اور انسانوں اور حیوانوں کو کھانے پینے کے لیے کوئی چیز نہ مل سکے اور یہ سب بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں۔

بیماری اور موت سے استدلال

صحت اور بیماری زندگی اور موت سب اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔ اگر وہ کسی شخص کو بیمار کرنا چاہے تو ہم ہزار جتن کے باوجود اس کی صحت واپس نہیں لا سکتے جب کہ اس جیسی بیماری کے ہزاروں مریض معمولی علاج سے شفایاب ہو جاتے ہیں اور اس بیمار کے لیے بڑے سے بڑے ڈاکٹر اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کرنے کے باوجود اس کی صحت کو واپس نہیں لا سکتے اور بالآخر وہ شخص بیماری کے ایام گزارتا ہوا اس عالم سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی زندگی کی ایک میعاد مقرر کی ہے اور جب کوئی انسان اپنی زندگی کے سانس

پورے کرلیتا ہے تو خواہ وہ بادشاہ ہو یا فقیر بڑے سے بڑا ڈاکٹر ہو یا ماہر طبیب 'سائنس دان ہو یا فلسفی اسے بہر حال اس وقت مرنا ہی پڑتا ہے۔ بڑی سے بڑی کوشش اور اہم سے اہم سائنسی عمل ہزار جتن کے باوجود مدت حیات پوری ہونے کے بعد اسے موت کے چنگل سے نہیں بچا سکتا۔ اگر اس عالم اسباب سے کوئی ماوراء ہستی نہیں ہے تو پھر وہ کون سی طاقت ہے جو کسی بیمار کو تندرستی سے اور مرنے والے کو زندگی سے ہم کنار ہونے نہیں دیتی؟ اس نظام کائنات میں تو ہر چیز خود ایک نظام کی پابند ہے وہ کیسے کسی کو صحت اور زندگی سے روک سکتی ہے؟

نظام کائنات کے ربط اور تسلسل سے۔

اس نظام کائنات پر غور کیجئے سورج ہر روز ایک مقررہ جہت سے طلوع ہوتا ہے اور ایک مقررہ جہت میں غروب ہو جاتا ہے۔ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن ہر سال اپنے اپنے موسموں میں کھیتوں کا پروان چڑھنا پھولوں کا اپنے وقت میں کھلنا تمام روئے زمین میں ایک خاص طریقہ سے انسانوں کا پیدا ہونا اور اس کے بعد ایک وقت مقرر پر انسان کا مر جانا کیا یہ تمام سلسلہ کائنات ایک مقررہ اور مربوط نظام کے تحت جاری نہیں ہے؟ پھر کیا کوئی ہوش مند انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تمام منضبط اور مربوط نظام بغیر کسی خالق اور ناظم کے خود بخود اپنے آپ عدم سے وجود میں آگیا ہے؟

پانی کی فراہمی سے

پانی انسان کی بنیادی ضرورت ہے پانی کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ سمندر کا پانی اس قدر کڑوا ہوتا ہے کہ اس کے چند گھونٹ بھی حلق سے نیچے نہیں اتارے جا سکتے۔ پھر یہی پانی جب بخارات کی شکل میں طبقہ زمہریر یہ تک پہنچتا ہے تو بادلوں سے موسلا دھار ٹھنڈا میٹھا اور شفاف پانی بن کر برستا ہے۔ تو وہ کون ہے جو اس کڑوے پانی میں شکر گھول دیتا ہے؟ دریاؤں سے جو اکثر و بیشتر پانی حاصل ہوتا ہے وہ بھی بادل اور بارش کا فیضان ہوتا ہے اور پہاڑیوں کی بلند بانگ چوٹیوں پر جو برف جمی ہوتی ہے وہاں اس برف کو ان چوٹیوں پر کون جاتا ہے؟ کیا پہاڑوں کی چوٹیوں سے برفانی گھاٹیوں تک برف گرنے کا انتظام اور بادلوں کے ذریعہ پانی کی بہم رسانی کا نظام یونہی خود بخود وجود میں آگیا ہے؟ جب کارپوریش کا ایک نل بھی ایک مستری اور چند مزدوروں کے بغیر نہیں لگ سکتا تو پانی کی اس قدر عظیم الشان ترسیل کا انتظام کسی ایڈمنسٹریٹر (Administrator) کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ پھر یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہو گی کہ کارپوریشن جو ایک محلہ کو ٹیکس لے کر پانی فراہم کرے۔ اس کی نظامت کو تو ہم

تسلیم کر لیں اور جو ساری دنیا کو بغیر کسی ٹیکس کے پانی مہیا کر رہا ہے اس کے نظام اور اس قدرت کا ہم انکار کر دیں، جبھی تو وہ فرماتا ہے:

اَفَرَاَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ(68) ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ(69) لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنَاهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ(70)

ترجمہ: "یہ بتاؤ کہ تم جو پانی پی رہے ہو کیا بادلوں سے اس پانی کو تم نے اتارا ہے یا ہم اتارنے والے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس پانی کو اس قدر کڑوا کر دیں کہ تم پی بھی نہ سکو پھر تم کیوں اس کا شکر ادا نہیں کرتے"۔[2]

پانی کے حصول کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ زمین کے نیچے گہرائی میں پانی رکھا گیا ہے جس کو ہم ہینڈ پمپ (Hand Pump) اور ٹیوب ویل سے نکال کر اپنے کام میں لاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس پانی کو زمین کی تہہ میں کس نے رکھا ہے اور اتنے لاکھوں فٹ کی گہرائی میں جا کر رکھ بھی کون سکتا ہے؟ یہ بات تو وہی شخص کہہ سکے گا جو عقل و فہم سے بالکل عاری ہو کہ وہ پانی خود بخود وہاں موجود تھا۔ اس دنیا کے ہزاروں تجربات اور مشاہدات ہمیں بتاتے ہیں کہ یہاں خود بخود کچھ نہیں ہوتا۔ ایک کنستر میں بھی پانی خود بخود جمع نہیں ہوتا۔ زمین کی اتھاہ گہرائی میں لاکھوں مکعب فٹ پانی کسی طرح جمع ہو سکتا ہے؟ جن علاقوں میں دریاؤں اور نہروں کا پانی بھی نہیں پہنچ سکتا وہاں اللہ تعالیٰ جل شانہ نے زمین کے اس پانی کو دریائی پانی کا بدل بنا دیا ہے اور خود فرمایا ہے:

قُلْ اَرَاَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ(30)[3] اگر اللہ تعالیٰ زمین کے پانی کو نیچے گہرائی میں دھنسا دے تو بتلاؤ پھر تمہارے لیے کون پانی لے کر آئے گا۔

جس جگہ زمین کی گہرائیوں سے پانی نکالنے کی ضرورت تھی وہاں اسے زمین کے اندر گہرائیوں میں رکھا جہاں سخت پہاڑی اور تھریلی زمینیں ہیں اور زمین کو کھودنا مشکل ہے اس نے وہاں پانی کے چشمے جاری کر دیئے۔ کہیں برفانی چوٹیوں اور بادلوں کی لگاتار برسات سے دریاؤں کو رواں دواں کر دیا کہیں کنوؤں اور ندیوں کا انتظام کر دیا۔ غرض جس جگہ پانی کی بہم رسانی کی ضرورت جس طرح پوری ہو سکتی تھی اس طریقہ سے وہاں پانی کو پہنچایا۔ کیا پانی کی یہ حکیمانہ ترسیل کسی جلیل القدر حکیم اور زبردست قادر اور عظیم خالق کے وجود کا تقاضا نہیں کرتی، کیا اب

---

[2] (الواقعہ ۶۸-۷۰)

[3] الملک (۳۰)

بھی کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ خلق خدا کی ضرورت اور مصلحت کے مطابق ہر جگہ ان کے مقام کے مناسب یہ پانی خود بخود بغیر کسی پہنچانے والے کے پہنچ رہا ہے؟

نظام کائنات کے تناسب سے

زمین و آسمان کی پہنائیوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ قائم کیا ہوا ہے۔ مکھی سے لے کر ہاتھی تک دیکھئے اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر ایک جسم کی ساخت اس کے حسب حال بنائی ہے۔ ہاتھی کے عظیم جثہ میں اس کی ضرورت کے جو اعضاء پیدا کیے ہیں وہ تمام اعضاء مکھی کی معمولی جسامت میں بھی موجود ہیں۔ حشرات الارض سے لے کر درندوں تک چرندوں سے لے کر پرندوں تک جانوروں کی ہر نوع کو دیکھئے ہر جانور میں اس کی بے عیب خلقت اور عظیم حکمت کے آثار نظر آئیں گے۔ پھر اس نے ہر جانور کی ایک غذا مقرر کی اور اس کو اپنی غذا کے حصول کے راستے اور اپنے سے بڑے جانوروں سے تحفظ کے طریقے سکھائے۔ شمال مغربی سرد اور برفانی علاقوں کے جانوروں کو دیکھئے ان کے جسم پر لمبے لمبے اور گھنے اونی بال نظر آئیں گے۔ بالوں کی یہ افزائش ان کا علاقائی سردی سے تحفظ کرتی ہے اور مشرقی اور گرم علاقوں میں ان جانوروں پر یہ بال نہیں ہوتے کیونکہ اگر۔ اس قدر گرم علاقوں میں ان پر یہ بال ہوں تو وہ گرمی سے جھلس کر رہ جائیں۔ اسی طرح ہر علاقہ کے رہنے والے انسانوں کے مزاج کو وہاں کے حسب حال بنایا ہے افریقہ اور اس جیسے گرم علاقوں میں رہنے والوں کا مزاج اس قسم کا بنایا ہے کہ وہاں کی شدید گرمی کو برداشت کر سکیں اور شمال مغربی علاقوں میں جہاں بے انتہا ٹھنڈ پڑتی ہے۔ وہاں کے رہنے والوں کے مزاج میں اس سخت سردی کو سہارنے کا عنصر رکھا ہے۔ یہ حکیمانہ تدبیر اور ہر مخلوق کی حسب حال رعایت اور یہ حسین عالمی انتظام دیکھ کر کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ علم و حکمت کا یہ عجیب و غریب کارخانہ بغیر کسی چلانے والے کے از خود چل رہا ہے؟

کرن اُمید سے

امام جعفر صادق کی ایک بار ایک دہریہ سے ملاقات ہوئی جو وجود باری تعالیٰ کا انکار کرتا تھا آپ نے اس سے پوچھا کیا کبھی تم سمندر میں کشتی میں سوار ہوئے ہو؟ اس نے کہا: ہاں! آپ نے پوچھا، کبھی طوفان کا سامنا بھی کیا؟ اس نے کہا: ہاں! کشتی ٹوٹ پھوٹ گئی ملاح ڈوب گیا اور لہروں کے تھپیڑے مجھے ساحل تک لے آئے۔

آپ نے فرمایا: پہلے جب تو کشتی بیٹھا تھا تو تیرا اعتماد ملاح پر تھا اور جب ملاح طوفانی لہروں سے ڈوب گیا تو پھر تیرا اعتماد کشتی پر تھا اور جب کشتی ٹوٹ گئی اور تو ایک تختے کے سہارے بہنے لگا تو تیرا بھروسہ اس تختہ پر تھا اور جب تختہ بھی تیرے ہاتھ سے نکل گیا اور تو محض لہروں کے رحم و کرم پر بہہ رہا تھا اور طوفانی لہریں تھے غرقاب کر دی تھیں اس وقت تیرا کیا خیال تھا کہ یہ لہریں تجھے غرق کر دیں گی یا اس وقت بھی تیرے دل میں امید کی کوئی کرن باقی تھی؟ وہ کہنے لگا: میں اس وقت بھی پر امید تھا کہ شاید سلامتی سے نکل آؤں۔ امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اب جب کہ سارے مادی اور ظاہری سہارے ایک ایک کر کے چھوٹ چکے تھے اس وقت تو نے کس ذات کے ساتھ امید قائم کی ہوئی تھی کہ وہ تجھ کو بچالے۔ دہریہ خاموش رہا آپ نے فرمایا: جس وقت کوئی مادی اور ظاہری سہارا نہ رہے اور سلامتی کے اسباب ایک ایک کر کے سارے ختم ہو جائیں اس وقت جس ذات سے امید قائم ہوتی ہے اور بے چارگی کے لامتناہی اندھیروں میں جس ذات سے مدد کی روشنی ملتی ہے وہی تیرا اور سارے جہان کا پروردگار ہے اس نے تجھ کو غرق ہونے سے بچالیا اس کی یہ شان ہے کہ انسان جب چاروں طرف سے مایوسیوں میں گھر جاتا ہے اور اسے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ عنقریب اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں میں گھر کر ختم ہو جائے گا کہ اچانک وہ غیب سے اس کی سلامتی کے اسباب پیدا کر دیتا ہے اس لیے اس نے فرمایا ہے "وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَهٗؕ وَهُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ[4] (28) وہ ذات جو لوگوں کے مایوس ہونے کے بعد اچانک موسلا دھار بارش نازل فرما دیتی ہے اور اپنی رحمت کو عام کر دیتی ہے وہی لوگوں کے کام بنانے والی اور قابل ستائش ہے۔

مایوسی کے وقت مشرکوں کے رجوع الی اللہ سے

جب انسان مصیبتوں کے جنجال میں پھنس جاتا ہے اور اسے نجات کا کوئی راستہ نہیں ملتا اس وقت کٹر سے کٹر کافر بھی اللہ کی طرف رجوع کر لیتا ہے جب خشکی اور تری کے سفروں میں لوگ مبتلائے آفات ہو کر پریشان ہو جاتے ہیں اور ایسی شدید صعوبتیں اور ہولناک طوفان پیش آتے ہیں، جن سے ذہن پریشان دل مضطرب اور بدن کا رواں رواں خوف سے کانپنے لگتا ہے ایسے ہولناک سفر میں بت پرست اور ضدی سے ضدی مشرک بھی اپنے بتوں کو بھول جاتا ہے اور بڑے سے بڑا دہریہ بھی اپنے الحاد سے توبہ

[4](الشوری:۲۸)

کر لیتاہے اوران تمام لوگوں کواس وقت اپنے عقیدہ سے تراشے ہوئے سارے باطل خداٹوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس وقت انہیں خدائے واحد کے سواکسی کے دامن میں پناہ نظر نہیں آتی اور چاروناچار سب کے سب اسی اللہ کے حضور گڑگڑاتے ہیں اور ہر شخص اس کی رحمت کے سامنے دامن پھیلا دیتاہے اور رورو کر کہتاہے: اے احکم الحاکمین اور اے سارے جہاں کے رب! اگر تو نے اس بار ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دی تو پھر ہم الحاد اور شرک کو چھوڑ کر صرف تیری بندگی بجالائیں گے اور جب اللہ تعالی ان کو مصیبت کے اس بھنور سے سلامتی کے ساتھ نکال لاتاہے تو یہ اللہ تعالی کے احسان کو یکسر فراموش کر کے پھر الحاد اور شرک کے گڑھوں میں جا گرتے ہیں۔ اللہ تعالی اس حالت کا لانہ کھلیں ہوا فرماتاہے۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَّئِنْ اَنْجَانَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ(63) قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ(64) [5]

اے رسول! آپ کہیے، وہ کون ہے جو تمہیں جنگلات اور سمندروں کی مصیبتوں سے نجات دیتاہے؟ جس کو تم آہستہ آہستہ اور گڑگڑا کر پکارتے ہو کہ اگر وہ اس مرتبہ ہم کو مصیبت کے اس گرداب سے نکال دے تو ہم ضرور اس کا احسان مانیں گے آپ کہیے کہ اللہ تعالی تم کو صرف اس مصیبت سے ہی نہیں ہر تکلیف سے نجات دیتاہے۔ لیکن مصائب سے چھٹکارا پانے کے بعد پھر تم اس کا احسان فراموش کر کے شرک کی پستیوں میں جا گرتے ہو۔

نفس انسان کی شہادت سے

مصائب اور پریشانیوں میں گھر جانے کے بعد ہر انسان فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتاہے اور اس سے اللہ تعالی کے اس فرمان کی تصدیق ہوتی ہے: وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ(20) وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا

[5] (الانعام: ۶۳-۶۴)

تُبْصِرُوْنَ[6] (21) یقین کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات پر زمین میں بھی نشانیاں ہیں اور ان کے اپنے نفسوں میں بھی کیا تم غور نہیں کرتے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کے نفس میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر شہادت اور دلیلیں موجود ہیں جن پر اس نے کفر الحاد اور شرک کے پردے ڈالے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کی زندگی میں کبھی نہ کبھی کوئی ایسا موقع ضرور آتا ہے جب کسی اچانک حادثہ سے شرک اور الحاد کے یہ سارے حجاب اچانک اٹھ جاتے ہیں اور توحید کی شہادت بے نقاب ہو کر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور وہ بے ساختہ اللہ تعالیٰ جل مجدہ الکریم کے حضور جھک جاتا ہے۔

ابو جہل کے بیٹے عکرمہ کی زندگی میں اسی شہادت سے انقلاب آیا جب حضور ﷺ نے مکہ معظمہ کو فتح کر لیا تو عکرمہ نے جدہ کا رخ کیا اور ایک کشتی میں سوار ہو کر حبش جانے کا قصد کیا۔ راستہ میں سخت طوفان آیا اور کشتی طوفانی لہروں میں گھر گئی پہلے پہل تو تمام بت پرست اپنے اپنے بتوں اور دیوتاؤں کو پکارتے رہے مگر طوفان کی ہولناکیاں بڑھنے لگیں اور مسافروں کو یقین ہو گیا کہ اب کشتی ڈوب جائے گی۔ جب دیوتاؤں کی شکتی کا مان جاتا رہا تو سب بے اختیار پکار اٹھے کہ اب سوائے اللہ کے اور کوئی بچانے والا نہیں ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ اس خدائے واحد کے دروازہ رحمت پر دستک دی جائے۔ پھر سب نے مل کر بیک آواز اس کی رحمت کو پکارا اور گڑگڑا کر دعائیں مانگنی شروع کر دیں، عکرمہ کی زندگی میں یہ ایک انقلاب آفریں لمحہ تھا انہوں نے سوچا کہ ان کے تصور کے تراشے ہوئے سارے بت بے حقیقت ہیں، ان کی بصیرت جاگی اور انہوں نے سوچا: جو خدا یہاں ان کی کشتی کو طوفان کے گرداب سے نکال سکتا ہے وہ درحقیقت خشک و تر ہر جگہ اپنے بندوں کی فریاد سنتا ہے اور ان کی مدد کرتا ہے۔ اس وقت ان کی آنکھوں کے سامنے سے غفلت اور جہالت کے سارے پردے اٹھ گئے اور دل پر کفر والحاد کے جس قدر حجاب پڑے ہوئے تھے یکلخت دور ہو گئے اور ان کے نفس میں جو توحید کی شہادت مستور تھی وہ پوری قوت اور توانائی کے ساتھ ابھری اور انہوں نے اپنے دل میں عہد کیا کہ اگر یہ کشتی اس طوفان سے نکل گئی تو میں

---

[6](الذاریات: ۲۰-۲۱)

سیدنا محمد ﷺ کے قدموں میں حاضر ہوں گا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا اور اس خدائے واحد پر ایمان لاؤں گا جس کی بحر و بر پر حکومت ہے جو طوفانوں کے رخ پھیر سکتا ہے، ہر قسم کی مصیبت کو ٹال سکتا ہے اور جس کو اس عظیم کائنات کی لامحدود وسعتیں کہیں بھی کسی بے بس اور لاچار کی فریاد سننے سے روک نہیں سکتیں۔ چنانچہ سلامتی سے ساحل پر آنے کے بعد انہوں نے اپنا عہد پورا کیا اور صدق دل سے مسلمان ہوئے اور بقیہ تمام عمر خدمت اسلام میں گزار دی۔

(جاری ہے۔۔۔)

تروتیجِ الحاد کے اسباب (قسط پنجم)

فیصل ریاض شاہد

5۔دیگر اسباب

الحاد کے بلا واسطہ اور بلواسطہ اسباب کی تعداد کا مکمل احاطہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ الحاد نا صرف یہ کہ منفیت کا نتیجہ ہے، بلکہ بعض مثبت اشیاء بھی مسخ ہو کر الحاد کی وجہ بنی ہیں۔ سطور بالا میں میں نے چند اہم اسباب کی درجہ بندی کر کے ان پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے؛ یہاں الحاد کے متفرق اسباب پیش کئے جا رہے ہیں۔

1) فیشن اپنی اصل میں ماخذ نہیں بلکہ نتیجہ ہے۔ لیکن جدید ذہن نے فیشن کو بھی اپنے الحاد کے جواز کے طور پر پیش کیا ہے۔ اسکی وجہ یہی ہے، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ جدید ذہن الٹا ہے، یہ ہمیشہ الٹی سمت میں چلتا ہے۔ اشو issue کو نان اشو اور نان اشو کو اشو بنانا اس کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ جدید الحادی معاشروں پر غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ جدید الحاد سراسر ایک فیشن ہے، لوگ اس وجہ سے ملحد نہیں ہو رہے کہ ان کے ہاتھ کوئی دلیل لگ گئی ہے۔ جس طرح دیکھا دیکھی میں دیگر بہت سی بیہودہ باتیں اور ٹرینڈز Trends چل پڑتے ہیں، جدید الحاد بھی اسی طرح ایک ٹرینڈ کے طور پر پھیل رہا ہے۔

2) جیسے مذہبی معاشروں میں مذہب نسل در نسل منتقل ہوتا ہے عین اسی طرح ملحد معاشروں میں الحاد بھی وراثت میں ملتا ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کے فرمان عالی شان ہے کہ ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے یعنی ہر انسان کی فطرت اصلاً مسلمان ہوتی ہے لیکن اس کے ماں باپ اور معاشرہ اس کی فطرت کو مسخ کر کے اسے بے دین یا لادین بنا دیتے ہیں۔ جیسا کہ تبدیلی مذہب کا معاملہ بہت کم کم دیکھنے میں آتا ہے، ایسے ہی ملحدین کا ترک الحاد کا معاملہ بھی کم کم ہی سننے کو ملتا ہے۔ ملحد گھرانوں میں پیدا ہونے والے بچے عموماً تمام عمر الحاد ہی کی تاریکی میں گزار دیتے ہیں۔

3) مذہب کی ابتداء کے حوالے سے بنیادی طور پر دو تصورات پائے جاتے ہیں؟

الف۔ مذہبی تصور

ب۔ عمرانی تصور

مذہبی تصور یہ ہے کہ خدا نے انسان کو آزمائش کیلئے دنیا میں بھیجا اور پھر اس کی ہدایت کیلئے انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا۔ یہ سلسلہ نبوت سیدنا حضرت آدم سے شروع ہوتا ہے اور نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ پر ختم ہوتا ہے۔ اسلام کے مطابق توحید انسان کا اصل مذہب ہے جو بعد میں شرک آلود ہو گیا۔ انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد توحید کی تطہیر تھا جبکہ جدید الحادی عمرانی تصور کے مطابق چونکہ خدا نامی کوئی ہستی موجود ہی نہیں پس یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ مذہب خواب اور خوف کی پیداوار ہے۔ ابتدا میں انسان مشرک اور کثریت پرست تھا۔ آہستہ آہستہ اس پراسرار جہاں کھلتے چلے گئے اور اس کے خداوں کی تعداد کم ہوتے ہوتے ایک تک رہ گئی۔ اس جدید تصور مذہب نے جدید تعلیم یافتہ، خصوصا مغربی تعلیم یافتہ طبقے کو بری طرح متاثر کیا ہے۔

4) یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بے دین اور لادین کبھی بھی اسلام یا مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ پوری اسلامی تاریخ بھی اس حقیقت پر مہر ثبت کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی ممالک کو باہم متصادم اور منتشر رکھنے کیلئے دشمنان اسلام نے ہر زمانے میں ہر قسم کا حربہ اپنایا ہے۔ کبھی براہ راست جنگیں مسلط کیں اور کبھی زمین روز کار دائیوں کے ذریعے مسلمانوں کو کمزور کیا گیا۔ دور حاضر میں بھی مسلمانوں کی باہمی تفریق کی تقریبا سب سے بڑی وجہ انہی دشمنان اسلام کی سازشیں ہیں۔ لادین اور بے دین عناصر کی اس اقدامی جنگ اور فکری دہشت گردی میں لبرل ازم اور سیکولرازم کے آدرشوں کا پرچار کرنے والی NGOS براہ راست ملوث ہیں۔ گزشتہ دو سے تین دہائیوں میں ان NGOS کے ہاتھ کافی مضبوط ہو گئے ہیں جو دن دہاڑے نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ مسلمانوں کے عقائد وافکار پر حملہ آور ہیں، ظلم تو یہ ہے کہ انہیں سرکاری تحفظ بھی حاصل ہے؟ پاکستان میں جہاں کہیں ملحدین نظر آتے ہیں انہیں انہی این جی اوز کی اشیر باد حاصل ہے۔

کائنات کی وسعت اور خالقِ عظیم کی حکمت

محمد اسامہ مصطفائی

کائنات، ایک ایسی عظیم الشان تخلیق ہے جو ہر ماہر فلکیات، سائنسدان اور اہل عقل کو حیرت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس کی وسعت، اس کی گہرائی اور اس کی پیچیدگی ایسی ہے کہ انسان کا عقل و شعور اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے۔ جب بھی انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اس نے کائنات کے کسی گوشے کو سمجھ لیا یا اس کی سب سے بڑی دریافت کر لی، تو کچھ ہی عرصے بعد نئی تحقیق سامنے آتی ہے جو اس کے گمان کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ یہ کائنات محض ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک ایسی عظیم کتاب ہے جس کے ہر صفحے پر خالقِ کائنات کی حکمت، علم اور قدرت کے نشانات کندہ ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اللہ خلاق عظیم ہے")۔ یہ آیت نہ صرف کائنات کی عظمت کی طرف اشارہ کرتی ہے بلکہ اس کے پیچھے موجود خالق کی بے مثال صلاحیتوں کی گواہی دیتی ہے۔ اس مضمون میں ہم کائنات کی حیرت انگیز خصوصیات، اس کی وسعت اور اس کے اندر موجود تنوع کا جائزہ لیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ کس طرح قرآن کریم ہمیں اس عظیم تخلیق پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

کائنات کی وسعت: ایک ناقابل فہم عجوبہ:

ماہرین فلکیات کے مطابق، کائنات کی وسعت کا تخمینہ لگانا انسانی عقل کے بس سے باہر ہے۔ موجودہ مشاہداتی کائنات (*Observable Universe*) کا قطر

تقریباً93 ارب نوری سال ہے، یعنی روشنی جو ایک سیکنڈ میں تقریباً 300,000 کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے، اسے کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے میں 93 ارب سال لگ جائیں گے۔ یہ صرف وہ حصہ ہے جو ہمارے مشاہدے میں آتا ہے، جبکہ اس سے باہر کیا ہے، اس کا کوئی حتمی علم نہیں۔

کائنات میں اربوں کہکشائیں ہیں، جن میں سے ہر ایک میں اربوں ستارے اور ان کے گرد گھومتے سیارے موجود ہیں۔ ہماری اپنی کہکشاں، ملکی وے (Milky Way)، میں تقریباً 100 سے 400 ارب ستارے ہیں۔ یہ اعداد و شمار انسان کے تصور سے کہیں زیادہ بڑے ہیں۔ لیکن یہ صرف ستاروں اور سیاروں کی بات نہیں؛ کائنات میں عجیب و غریب مظاہر بھی موجود ہیں۔ کہیں ہیرے کی بارش ہوتی ہے جیسے کہ سیارہ Cancri e55 پر، جہاں کاربن کے کرسٹل ہیرے کی شکل میں بارش بن کر گرتے ہیں۔ کہیں پلازما کے طوفان ہیں، کہیں بلیک ہولز جو وقت اور روشنی کو بھی نگل لیتے ہیں، اور کہیں نیوٹران ستارے جن کا ایک چمچ مادہ اربوں ٹن وزنی ہوتا ہے۔ یہ تنوع اور پیچیدگی ہر اس شخص کو حیران کرتی ہے جو اس پر غور کرتا ہے۔

قرآن کریم اور کائنات پر غور و فکر کی دعوت:

قرآن کریم بار بار انسان کو کائنات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، رات اور دن کے بدلنے میں، عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔" (سورہ آل عمران)۔ یہ آیت نہ صرف کائنات کی عظمت کی طرف اشارہ کرتی ہے بلکہ اسے عقلمندوں کے لیے

ایک عظیم سبق قرار دیتی ہے۔ کائنات کی ہر شے، چاہے وہ ایک چھوٹا سا ذرہ ہو یا ایک عظیم کہکشاں، خالق کی قدرت کا مظہر ہے۔

قرآن کریم میں کائنات کی وسعت اور اس کی تخلیق کے بارے میں متعدد آیات موجود ہیں۔ مثلاً، سورہ الذاریات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اور ہم نے آسمان کو اپنی قدرت سے بنایا اور بے شک ہم وسعت دینے والے ہیں۔" (سورہ الذاریات:)۔ جدید سائنس نے اس آیت کی گہرائی کو اس وقت سمجھا جب یہ دریافت ہوا کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے، ایک حقیقت جو 20ویں صدی میں ایڈون ہبل کی تحقیق سے ثابت ہوئی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو قرآن نے چودہ سو سال قبل بیان کر دی تھی۔

کائنات کا تنوع اور خالق کی حکمت:

کائنات کا تنوع اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا خالق نہ صرف عظیم ہے بلکہ علیم اور حکیم بھی ہے۔ کائنات میں ہر چیز ایک خاص توازن اور نظام کے تحت کام کر رہی ہے۔ مثال کے طور پر، زمین کا اپنے محور پر چکر لگانا اور سورج کے گرد گردش کرنا اتنا متوازن ہے کہ اگر اس میں ذرا سی تبدیلی آجائے تو زندگی ناممکن ہو جائے۔ زمین کا سورج سے فاصلہ، اس کا ماحول، اس کی کشش ثقل، سب کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ زندگی ممکن ہو سکے۔ یہ سب کچھ محض اتفاق سے نہیں ہو سکتا؛ اس کے پیچھے ایک عظیم حکمت اور منصوبہ بندی ہے۔

اسی طرح، کائنات کے دوسرے مظاہر جیسے کہ بلیک ہولز، سپر نووا دھماکے، یا نیبولاز کی خوبصورتی، سب خالق کی تخلیقی صلاحیتوں کے مظہر ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمانوں اور

زمین میں جو کچھ ہے اسے تمہارے لیے مسخر کر دیا؟"(سورہ لقمان:)۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ کائنات کا ہر جزو انسان کے لیے ایک نعمت اور سبق ہے، اگر وہ اس پر غور کرے۔

سائنس اور قرآن: ایک ہم آہنگی:

جدید سائنس اور قرآن کریم کے درمیان کوئی تضاد نہیں۔ سائنس کائنات کے مادی پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے، جبکہ قرآن اس کے روحانی اور مقصدی پہلوؤں کو واضح کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، جب سائنسدان کائنات کے پھیلاؤ(*Big Bang Theory*) کی بات کرتے ہیں، تو قرآن اسے "فتق" کے لفظ سے بیان کرتا ہے:"کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین بند ھے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا؟"(سورہ الانبیاء:)۔ یہ آیت بگ بینگ کے تصور سے حیرت انگیز طور پر مطابقت رکھتی ہے۔

اسی طرح، کائنات کے اندر موجود تنوع، جیسے کہ مختلف سیاروں کی ساخت، ستاروں کی زندگی، یا نیبولاز کی تشکیل، سب قرآن کی اس دعوت کی تصدیق کرتے ہیں کہ انسان کو غور و فکر کرنا چاہیے۔ ہر نئی سائنسی دریافت قرآن کی آیات کی گہرائی کو مزید واضح کرتی ہے۔

کائنات اور انسان کا مقام:

کائنات کی اس عظیم وسعت میں انسان کا وجود بظاہر ایک چھوٹا سا ذرہ معلوم ہوتا ہے، لیکن قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ انسان اللہ کی سب سے عظیم

تخلیق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں بنایا" (سورہ التین:)۔ انسان کو عقل اور شعور عطا کیا گیا تاکہ وہ کائنات کے اسرار کو سمجھ سکے اور اپنے خالق کی عظمت کو تسلیم کرے۔

کائنات کی وسعت اور خوبصورتی انسان کو یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ ایک عظیم خالق کے سامنے ہے جو نہ صرف خلاق ہے بلکہ علیم، حکیم اور رحیم بھی ہے۔ ہر ستارہ، ہر سیارہ، ہر کہکشاں اس کی قدرت کا ایک نشان ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا: "اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز کا نگراں ہے")۔

خالقِ عظیم کی طرف رجوع:

کائنات کی وسعت، اس کا تنوع اور اس کا نظام ہر عقلمند انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس کے پیچھے ایک عظیم خالق ہے۔ قرآن کریم ہمیں بار بار اس عظیم تخلیق پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ ہم اپنے خالق کی عظمت، اس کے علم اور اس کی حکمت کو سمجھ سکیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "ہر چیز کو اس نے ایک خاص انداز سے بنایا اور اسے اس کی راہنمائی دی")۔

آج جب ہم جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے کائنات کے نئے گوشوں کو دریافت کر رہے ہیں، ہر نئی دریافت ہمیں اس حقیقت کی طرف لے جاتی ہے کہ یہ سب ایک عظیم منصوبے کا حصہ ہے۔ کائنات کی یہ عظیم الشان کتاب ہر اس شخص کے لیے ایک دعوت ہے جو اپنے خالق کو پہچاننا چاہتا ہے۔ آیئے، ہم اس کتاب کے اوراق پلٹیں، اس کے اسرار کو سمجھیں اور اس کے خالق کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ "بے شک اللہ خلاق عظیم ہے"، اور اس کی کائنات اس کی عظمت کی زندہ گواہی ہے۔

تعارفِ کتب: قدس کو یہودی شہر بنانے کی کوشش (مصنف: ڈاکٹر انور محمود زناتی)

محمد یاسر مشتاق

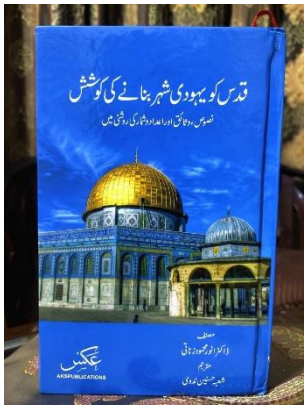

سلسلہ تعارفِ کتب#5

قدس کو یہودی شہر بنانے کی کوشش

مصنف؛ڈاکٹر انور محمود زناتی

(ناشر؛عکس پبلشر03004827500)

اسلوبِ مصنف

بقولِ مصنف اس مطالعہ میں ایک واضح طریقہ کار اپنانے کی غرض سے میں نے واقعات کو صرف تاریخی انداز میں بیان کر دینے سے اجتناب کیا ہے، اس کے بر عکس میں نے علمی طریقہ اپناتے ہوئے حوادث واقعات کا تحلیل و تجزیہ کیا ہے۔ اور اس سے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں اصل مصادر و مآخذ کا استعمال کرتے ہوئے بعض روایات کی تردید بھی کی ہے۔ اس مطالعہ کے دوران میں نے مختلف علمی مناہج کا استعمال کیا ہے مثلاً استقرائی منہج اور مضمون کی تحلیل و تجزیہ کا منہج جس میں تمام نصوص وثائق اور اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر تحلیل و تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس کے گرد کچھ افتراضات قائم کیے جاتے ہیں تاکہ مختلف و منتشر سوالات کا حل مل سکے۔

کتاب پر تبصرہ

160 صفحات پر مشتمل اس کتاب کو مصنف نے مقدمہ، دو فصلوں اور خاتمہ پر تقسیم کیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ کے بارے میں مصنف کہتے ہیں کہ میں نے اس مقدمہ کو قصداً اس کتاب کے مقدمہ کے مشابہ رکھا ہے جو

میں نے سقوط سے متعلق اندلس کے حالات پر لکھی ہے، اس سے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان دونوں ملکوں کے حالات کے مابین بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔

عام طور پر قضیہ فلسطین پر گفتگو تاریخی، تہذیبی، تمدنی، مذہبی، جیوپالیٹکس اور بین الاقوامی تناظر میں عالمی اداروں اور عالمی طاقتوں کے کردار کے حوالے سے کی جاتی ہے جبکہ اس کتاب میں مصنف نے خاص اس شہر قدس (دیگر نام؛ بیت المقدس، مدینۃ اللہ، المدینۃ المقدسہ، مدینۃ السلام، یروشلم، ایلیا، موریا) کو مخصوص تناظر میں موضوعِ تحقیق بنایا ہے۔

بنیادی طور پر یہ کتاب دو چیزیں بیان کرتی ہے

- ✓ (1) تاریخی شہادتوں کی روشنی القدس شہر پر سیادت و قیادت کا حق کسے حاصل ہے؟؟
- ✓ (2) القدس کو یہودی شہر بنانے کی اسرائیلی کوششیں!!

فصل اول؛ نصوص اور تاریخ

- القدس کا لغوی معنی پاکی و طہارت ہے۔ سامی زبانوں میں اس کا معنی صاف ستھرا، پاکیزہ اور بلند تر ہے۔
- لفظ قدس اور اس شہر کا آغاز ہی اس بات پر دال ہے کہ یہ شہر در حقیقت عربی ہے اور عرب خصوصیات کا حامل ہے، جب ہم شہر قدس کی طویل تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس قدیم شہر سے یہودیوں کا رشتہ بہت ہی عمومی رہا ہے، وقفہ وقفہ سے مختلف سالوں میں وہ اس شہر میں آکر آباد ہوئے ہیں، جیسا کہ وہ بعد کے دنوں میں وقفہ وقفہ سے دنیا کے مختلف علاقوں میں آباد ہوتے رہے ہیں۔
- صہیونیوں کا یہ دعوی کہ شہر یروشلم (قدس) کی بنیاد زمانہ قدیم میں یہودیوں نے رکھی تھی، بالکل درست نہیں ہے۔ یہ علمی طور پر ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ لفظ یروشلم عرب کنعانی زبان سے ماخوذ ہے۔
- یہ در حقیقت کنعانی زبان کے دو لفظوں کا مرکب ہے:
- یوری جس کے معنی شہر کے ہیں

- اور شلیم جو کنعانیوں کے ایک خدا کا نام تھا جس کے معنی امن و آشتی کے ہیں۔ یوں یروشلم کے معنی بنتے ہیں امن و آشتی کا شہر

فلسطین کے سب سے قدیم نام کنعان کی طرف پہلا اشارہ

تل العمارنہ (تل العمارنہ مصر میں نیل کے کنارے واقع ہے، اس خطہ میں آثار قدیمہ کی دریافت ہوئی جسے رسائل تل العمارنۃ کے نام سے جانا جاتا ہے، یہ رسائل در حقیقت بہت ساری تختیوں کا مجموعہ ہیں جو بابلی زبان میں بہت سارے مسماری تحریرات ہیں، یہ در حقیقت ان محفوظ کئے جانے والے خطوط کا ایک حصہ ہیں جو فرعون شہنشاہوں اور دوسرے ممالک کے شہنشاہوں کے درمیان لکھے جاتے تھے تل العمارنہ کا زمانہ چودہ صدی قبل مسیح سے پہلے کا ہے) کی کھدائی کے دوران پایا گیا، اس کھدائی کے دوران جو نام پایا گیا وہ کیناہی یا کیناہنا ہے، اور ان دونوں کی اصل کنعان ہے۔ اس کھدائی سے مزید یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ نام ان شہروں کے لئے استعمال ہوتا تھا جو نہر اردن کے مغرب میں واقع ہیں، شام بھی ان میں سے ایک شہر ہے، توریت میں لفظ کنعان کا استعمال انہی شہروں کے لئے کیا گیا ہے، اس سے قاری کو واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہودیوں کی مقدس کتاب توریت کا بھی اعتراف یہی ہے کہ فلسطین یہودیوں کا شہر نہیں ہے، یہودی حضرت یوشع بن نون کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے اس شہر میں داخل ہوئے تھے۔

- اس جانب مصنف ڈی ایل کارنیو نے بھی اشارہ کیا ہے کہ

"معاصر فلسطینی ہی صاحبِ حق ہیں، کنعانی ہی ہمیشہ سے فلسطین کے باشندے رہے ہیں، اسرائیل در حقیقت ایک چھوٹا سا قبیلہ تھا جس نے کنعان پر قبضہ کرنے کے لئے اس پر حملہ کیا تھا، کنعان کا نام بعد میں فلسطین رکھا گیا۔"

- مصنف جوزف ریان کا کہنا ہے کہ

"صہیونی دلائل اور حجتوں کے پیشِ نظر بعض حلقوں میں یہ تاثر قائم ہو گیا ہے کہ فلسطین کی قابل ذکر اور اہم تاریخ 70ء میں رک گئی تھی۔ یہ تاریخ دوبارہ اس

وقت شروع ہوئی جب تھیوڈر ہرتزل (پیدائش 1860ء) کی قیادت میں صہیونی تحریک کا آغاز ہوا۔"

- در حقیقت مسجد اقصی میں حضرت سلیمان کی تعمیر کردہ عمارت کی ایک اینٹ بھی باقی نہیں رہ گئی ہے۔ وہ ہیکل جسے حضرت سلیمان نے تعمیر کیا تھا منہدم و خاکستر ہو چکا ہے۔ حضرت سلیمان کی وفات کے تین صدیوں بعد اس ہیکل کے پھتر وہاں سے منتقل کئے جا چکے ہیں، یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب نبو خذ نصر نے 589ء قبل مسیح میں شہر قدس پر حملہ کیا تھا۔ اسی طرح تیطس (Titus) نے 70ء میں اس معبد کو نذر آتش کر دیا تھا جسے Herod نے 20 قبل مسیح میں تعمیر کیا تھا، اور اس کے پتھر کہیں دور لے جا کر پھینک دیئے تھے۔
- یہودی مورخ Josephus Flavius (پیدائش 37ء) نے قدس کا تذکرہ کرتے ہوئے ہیکل کے بارے میں کچھ بھی ذکر نہیں کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس ہیکل کو Titus نے منہدم کر دیا تھا اس کا کچھ بھی نام و نشان باقی نہیں رہ گیا تھا۔ 135ء سے اسلامی فتح تک قدس میں یہودیوں کو رہنے کی اجازت حاصل نہیں تھی۔

تاریخی حق (Historical Right) کے اعتبار سے سرزمین فلسطین کے سب سے زیادہ حقدار عرب فلسطینی ہیں، وہی اس سرزمین کے حقیقی مالک ہیں جو یہاں ہزاروں سال سے سکونت پذیر ہیں، بصورتِ مملکت سرزمین فلسطین میں یہودیوں کا وجود محض ایک عارضی وجود ہے، یہ وجود ایک بہت ہی مختصر مدت کے لئے ہے جس کی ان ہزاروں سال کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت نہیں جو عربوں نے فلسطین میں گزارے ہیں۔

- برطانوی مورخ Arnald Toynbee نے لکھا ہے

"قانونی اعتبار سے تمام تر اسرائیلی مملکت در حقیقت ہمیشہ سے ان عرب فلسطینیوں کی ملکیت رہی ہے جنہیں وہاں سے زبردستی نکال دیا گیا ہے، اور مستقبل میں بھی یہ ہمیشہ عرب فلسطینیوں کی ہی ملکیت رہے گی۔"

- یہودی مصنف الفرید لیلنتال نے بھی یہی بات کہی ہے کہ

"کنعانی ہی وہ پہلے لوگ ہیں جو فلسطین آئے، اس کے بعد دوسرے عرب قبائل آئے، پھر اس کے بعد عبری قبائل آئے۔"

بلکہ ہرتزل کے بعد دوسری سب سے بڑی صہیونی شخصیت میکس نورڈو کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ جب اسے فلسطین میں سب سے پہلے عربوں کے وجود کا پہلی مرتبہ علم ہوا تو اس نے ہرتزل کے سامنے اپنے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا: مجھے اس بات کا تو علم ہی نہیں تھا، ہم لوگ درحقیقت ظلم کر رہے ہیں۔

اگر فلسطین میں عربوں کے تاریخی صورت حال کا وہاں کے یہودیوں کے تاریخی صورت حال سے موازنہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ عرب فلسطین میں گذشتہ پانچ یا سات ہزار سال سے مسلسل رہائش پذیر ہیں، اس عرصہ میں ایک دن کا بھی انقطاع نہیں ہوا، جبکہ فلسطین میں یہودیوں کی مختلف چھوٹی چھوٹی حکومتیں مختصر مختصر مدت کے لئے قائم ہوئیں اور پھر وہ برسہا برس کے لئے معدوم ہو گئیں۔ پھر یہ حکومت 1948ء میں برطانوی استعمار، یورپ اور امریکہ کی مدد سے دوبارہ قائم ہوئی ہے۔

فصل دوم؛ شہر قدس کو یہودی رنگ میں رنگنے کے مختلف ذرائع ووسائل

اس فصل میں مصنف نے شہرِ قدس سے متعلق بیان کیا ہے کہ صیہونی کس طرح اخلاقیات، روایات اور بین الاقوامی قوانین کو پامال کرتے ہوئے قدس سے عربوں اور فلسطینیوں کی صدیوں پرانی تہذیب و ثقافت، آثار، مقدس مقامات اور ہر اس علامت کو ختم کرنے کا عزم بالجزم کیے ہوئے ہیں کہ جس سے اس شہر قدس کے متعلق پتا چلتا ہو کہ یہ شہر صدیوں سے عربوں اور فلسطینیوں کا وطن رہا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں قابض ریاست کے اقدامات کو ذکر کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بانی تحریک صیہونیت ہرتزل کی شہر قدس کو یہودی رنگ میں رنگنے کی خواہش کا ذکر کیا جائے۔ وہ کہتا ہے کہ

"اگر کسی دن یہودی قدس پر قابض ہو گئے اور میں اس دن باحیات رہا اور کچھ بھی کرنے کی صلاحیت اپنے اندر محسوس کر سکا تو سب سے پہلے میں ان تمام چیزوں کو ختم کر دوں گا جو یہودیوں کے ہاں مقدس نہیں ہیں، نیز برسوں سے جو آثارِ قدیمہ موجود چلے آرہے ہیں انہیں نذر آتش کر دوں گا۔"

قابض اسرائیلی ریاست کے اقدامات

- ✓ عرب گاؤں اور عرب واسلامی تہذیب کے آثار کو مٹانا
- ✓ 2) مسجد اقصیٰ پر اسرائیلی زیادتیاں
- ✓ عرب بستیوں کو مٹانے اور انہیں ہڑپنے کا منصوبہ
- ✓ عرب قدس میں اسرائیلی کھدائیاں
- ✓ 1967ء کے بعد شہر قدس میں اسرائیلی کھدائیاں
- ✓ 5) کھدائیوں اور زیادتیوں کا تسلسل
- ✓ مختلف مقامات کو اسرائیلی نام دینے کا ادارہ
- ✓ شہر قدس میں تعلیم کو یہودی رنگ دینے کی کوشش

1) عرب گاؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کو مٹانا

کسی بھی شہر کی شکل وصورت تبدیل کرنے کا یہ ایک شیطانی طریقہ ہے، جسے یہودیوں نے اپنا رکھا ہے، اور وہ یہ کہ عرب گاؤں اور علاقوں کے آثار مٹا دیے جائیں. وہاں سے حاصل ہونے والے قدیم پتھروں اور اینٹوں کو یہودی نو آبادیات میں استعمال کیا جائے، 1948ء کی جنگ میں صہیونی تحریک اور اس کی مختلف جماعتوں نے قدس کے تمام گاؤں کو تہس نہیں کر دیا تھا، اگر آپ قدس کے مختلف گاؤں سے گزریں تو باب العمود سے لے کر المالحۃ اور مستشفی ہداساتک کے مختلف فصیلوں میں آپ کو عرب گاؤں کے پتھروں اور اینٹوں کا استعمال نظر آئے گا، یہ چیز عبرانی یونیورسٹی، مستشفی ہداسا، محسنیہ یہود ا اور المالیۃ وغیرہ کے علاقوں میں بھی نظر آتی ہے۔ صہیونی قدس میونسپلٹی نے ان تعمیرات میں سمینٹ اور کنکریٹ کا استعمال نہیں کیا ہے، تاکہ ان کی خوبصورتی بھی باقی رہے اور دیکھنے والے کو لگے کہ یہ فصیلیں سینکڑوں سال پہلے تعمیر کی گئی تھیں، اور اس طرح صہیونی ان آثار کے ذریعہ جھوٹی یہودی تاریخ کو ثابت کر سکیں۔

قدیم مساجد کو شہید کیا گیا

اسرائیلی روزنامہ ہآرتس نے اپنے 4 جولائی 2007ء کے ہفتہ واری ضمیمہ میں ایک رپورٹ شائع کی جس میں اس بات کا اعتراف کیا گیا تھا کہ 1948ء میں فلسطینیوں پر شروع ہونے والے ظلم وزیادتی کے ابتدائی دنوں میں اسرائیلی فوج اور تنظیموں نے عرب علاقوں میں موجود دسیوں مساجد کو شہید کر دیا تھا، یہ کارروائیاں فلسطین کی عرب واسلامی تاریخ کو مٹانے کی منظم پالیسی کی ایک کڑی تھیں، اس کا حکم خود فوج کی قیادت کی جانب سے دیا گیا تھا اور اسے ڈیوڈ بن غوریون کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ ربابورط کے مطابق ان میں سے بعض مساجد جنوبی علاقہ کے فوجی قائد موشیہ دیان کے حکم سے منہدم کی گئی تھیں، ان منہدم ہونے والی مساجد میں ایک تو مسجد عسقلان تھی، اسدود میں بھی اس کے حکم سے مساجد کو منہدم کیا گیا تھا، یہ تینوں مساجد نہایت قدیم اور تاریخی اہمیت کی حامل تھیں، ان میں سے بعض تو ایک ہزار سال پرانی تھیں۔

2) مسجد اقصیٰ پر اسرائیلی زیادتیاں

یہودی مسجدِ اقصیٰ کو ہیکل سلیمانی کی جگہ تعمیر کردہ عبادت گاہ سمجھتے ہیں اور اسے شہید کر کے اس کی جگہ پر ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ کبھی بذریعہ دلیل اپنے اس دعوے کو ثابت نہیں کر سکے کہ ہیکل سلیمانی اسی جگہ تعمیر تھا جہاں پر مسجد اقصیٰ کو تعمیر کیا گیا ہے۔

1997ء کے اواخر میں امریکہ کے شہر سان فرانسسکو میں علماء آثار کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں تل ابیب یونیورسٹی کے اسرائیلی پروفیسر ڈیوڈ او سیشکین نے کہا کہ اس دریافت نے ان کی رائے مکمل طور پر تبدیل کر دی، وہ اب فنکاشتاین کی بات سے متفق ہیں جس نے یہ کہا تھا کہ یہ بات کہ تورات میں جو کچھ ہے وہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہے کچھ صحیح محسوس نہیں ہوتی، مجھے معلوم ہے کہ یہ بات بول کر میں نے شک کا ایک بیج بو دیا ہے۔ آثار قدیمہ کے اسرائیلی عالم مائیر بن دوف نے یہ کہہ کر تہلکہ مچا دیا تھا کہ مسجد اقصیٰ کے نیچے ہیکل کے کچھ بھی آثار نہیں پائے جاتے۔

دیوارِ براق/دیوارِ گریہ پر مسلمانوں کا حق

مسجدِ اقصیٰ کی دیوارِ براق کو مغربی دیوار اور دیوارِ گریہ بھی کہا جاتا ہے۔ دیوار گریہ کو تمام یہودیوں کے نزدیک مقدس مقام کا درجہ حاصل نہیں ہے، اور جو یہودی یہاں پر عبادت وعقیدت کی غرض سے حاضر ہوتے ہیں وہ بھی یہاں اس لیے نہیں آتے کہ یہ مقدس مقام ہے بلکہ ان کے مطابق یہ جگہ مزعوم ہیکل سلیمانی سے قریب تر ہے، اور ہیکل سلیمانی سے جس قدر قریب رہ کر دعا اور عبادت کی جاتی ہے وہ اتنی ہی جلدی خدا تک پہنچتی ہے اور مقبولیت حاصل کرتی ہے۔

در حقیقت یہ اسلامی رواداری کا ہی نتیجہ ہے کہ یہودی دیوار براق کے سامنے اپنی عبادت ادا کرتے ہیں، جس دور میں فلسطین پر برطانیہ حکمرانی کرتا تھا اس دور میں یہودیوں نے دیوار براق پر قابض ہونے کی بہت ساری کوششیں کیں یہاں تک کہ اگست 1929ء میں براق انقلاب رونما ہوا، اس انقلاب میں سیکڑوں عرب اور یہودی جان سے گئے، اس کے نتیجے میں ایک بین الاقوامی کمیٹی تشکیل دی گئی تاکہ مسجدِ اقصیٰ کی دیوار براق پر عربوں اور یہودیوں کے حقوق کے حدود کو متعین کیا جاسکے،

سویڈن کے سابق وزیر خارجہ اس کمیٹی کے صدر تھے اور اس کے دو رکن تھے جو سویزرلینڈ اور ہالینڈ کے تھے، اس کمیٹی نے 1930ء میں اپنی رپورٹ پیش کی، رپورٹ میں یہ بات کہی گئی تھی کہ

"مغربی دیوار پر ملکیت کا حق صرف مسلمانوں کو ہی حاصل ہے، وہی اس دیوار کے تنہا حقدار ہیں کیونکہ دیوار براق حرم شریف کا ایک جزء ہے اور حرم شریف مسلمانوں کا وقف ہے، دیوار براق اور المغاربہ بستی کے سامنے واقع چبوترہ اور فٹ پاتھ پر بھی صرف مسلمانوں کا حق ہے، کیونکہ اسے اسلامی شریعت کے احکام کے مطابق وقف کیا گیا تھا۔"

3) عرب بستیوں کو مٹانے اور انہیں ہڑپنے کا منصوبہ

1967ء میں صیہونیوں کے دیوارِ براق پر قابض ہونے اور عربوں کے شکست کھا جانے کے بعد اس واقعہ کو سیلیبریٹ کرنے کی غرض سے اس دیوار کے گرد بہت سارے اسرائیلی قائدین جمع ہوئے، اس موقع پر یہودی

عبادت کی سربراہی حاخام غورین نے کی، نزول تورات کے دن کو منانے کے لیے یہودی قیادت نے ہزاروں یہودیوں سے اس دیوار کے گرد جمع ہونے کی اپیل کی لیکن یہ جگہ اتنے سارے یہودیوں کے جمع ہونے کے لئے تنگ تھی وہاں صرف چند سو یہودی ہی جمع ہو سکتے تھے، لہذا صہیونی حکومت نے 10 جون 1967 کو اس دیوار سے متصل بستی کو منہدم کرنے کا حکم جاری کر دیا، چنانچہ چند ہی دنوں کے اندر وہ قدیم بستی جسے عرب گزشتہ 774 سال سے "حارۃ المغاربۃ" کے نام سے پکارا کرتے تھے مکمل طور پر منہدم کر دی گئی۔

جن عرب بستیوں کو اسرائیلی حکومت مٹانے اور ہڑپنے کا منصوبہ رکھتی ہے انہیں اس کی اصطلاح میں الحوض المقدس کہتے ہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ شہر قدس کو یہودی اس شکل میں کر سکیں جس کا خواب ان کے آباء و اجداد نے تین ہزار سال قبل دیکھا تھا، شہر قدس کے بیس سالہ منصوبہ (۲۰۰۰ء سے ۲۰۲۰ء تک) میں بھی غاصب یہودی میونسپلٹی نے یہی بات کہی تھی۔

4) عرب قدس میں اسرائیلی کھدائیاں

مدرسة الآثار البريطانية في القدس کی ڈائرکٹر اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں علم الآثار کی پروفیسر ڈاکٹر کیتھلن کینن کہتی ہیں "حرم قدسی کے گرد اثرائیل کی جانب سے کی جانے والی کھدائیاں درحقیقت قدیم آثار اور تاریخ کو مٹانے کا ایک گھناؤنا عمل ہے، قرون وسطی کی اسلامی تعمیرات و آثار کو ختم کرنا درحقیقت ایک بڑا جرم ہے۔ ان کھدائیوں کے ذریعہ سے اسلامی آثار کی شکل تبدیل کرنے کی کوشش کرنا دانشمندی کا اقدام نہیں ہے۔"

5) 1967ء کے بعد شہر قدس میں اسرائیلی کھدائیاں

ان کھدائیوں کا آغاز 1967ء کے اواخر میں ہوا تھا، یہ کھدائیاں ابھی تک (وقت تصنیف) بلا کسی توقف کے جاری ہیں، حالانکہ سلامتی کونسل، اقوام متحدہ اور یونیسکو نے اسرائیل کو ان کھدائیوں پر روک لگانے کا حکم دے رکھا ہے

،ان میں سے چند کھدائیوں کا ذکر:

- مسجد اقصیٰ کے جنوبی جانب کھدائیاں

یہ کھدائیاں 1968ء میں حرم کے جنوبی دیوار کے نیچے ستر میٹر تک کی گئی تھیں، ان کھدائیوں میں عہد اموی، عہد رومانی اور عہد بازنطینی کے آثار ملے تھے۔

- مسجد اقصیٰ کے جنوب مغربی جانب کھدائیاں

اس جانب کھدائیاں 1969ء میں 80 میٹر تک ہوئی تھیں، ان کھدائیوں کا آغاز وہاں سے ہوا تھا جہاں تک پہلی کھدائیوں کا اختتام ہوا تھا اور یہ کھدائیاں شمال میں باب المغاربہ تک چلی گئی تھیں، اس درمیان میں بہت ساری اسلامی عمارتیں موجود تھیں جو ان کھدائیوں کی وجہ سے اندر سے کمزور ہو گئی تھیں، لہذا اسرائیلی حکام نے ان عمارتوں کو 14 جون 1969ء کو منہدم کر دیا، اس جگہ پر عہد اموی کے تین محلوں کی بنیادیں بھی ملی تھیں۔

مسجد اقصیٰ کے نیچے جتنی دور تک سرنگیں بنائی گئی ہیں ان میں جابجا یہودیوں نے اپنے عبادت خانے اور ہیکل کے مجسمات بنا رکھے ہیں، یہودی وہاں عبادت کے لئے جاتے ہیں، وہ ان عبادت خانوں میں ان سیڑھیوں کے ذریعہ جاتے ہیں جو اسرائیل نے المصلی المروانی کے قریب بنا رکھی ہیں، ان زمینی سرنگوں کے ذریعہ بعض یہودی ایک سے زائد مرتبہ حرم قدسی میں داخل ہو کر اس کے تقدس کو بھی پامال کر چکے ہیں۔

6) مختلف مقامات کو اسرائیلی نام دینے کا ادارہ

ڈیوڈ بن غوریون نے اپنے افسروں کو حکم دیا کہ تمام فلسطینی ناموں کو ختم کر دیا جائے خواہ وہ نام عربی ہوں یا اسلامی و مسیحی ہوں یا کنعانی یبوسی و عموری ہوں، ان سب ناموں کو عبرانی ناموں سے تبدیل کر دیا جائے۔ اس حکم کے بعد سے شہروں و گاؤں کے عربی ناموں کو منظم طریقہ سے یہودی و عبرانی ناموں سے تبدیل کیا جانے لگا، یہ کام ایک ایسے ادارہ کے ذریعہ کیا جانے لگا جسے مختلف مقامات کو اسرائیلی نام دینے کے لئے قائم کیا گیا تھا، اس کے لئے اسرائیلیوں نے مختلف طریقے اپنائے، مثلاً کسی ایک حرف کو دوسرے حرف سے تبدیل کر دینا، اصل نام کا عبرانی میں ترجمہ کر دینا، مثال کے طور پر جبل الزیتون کا نام ہار ہزیم اور جبل الرادار کا نام ہار دار رکھ دیا گیا۔ ایک یہ طریقہ

بھی اپنایا گیا کہ عربی نام میں اس طرح تبدیلی کی جائے کہ وہ عبرانی لگنے لگے مثلاً گسلا کا نام کسلون اور الجیب کا نام جبعون رکھ دیا گیا۔ اسی طرح بہت سارے راستوں، سڑکوں اور پبلک پلیس کے نام بھی یہودی ناموں سے تبدیل کر دیئے گئے۔

7) قدس میں تعلیم کو یہودی رنگ دینے کی کوشش

اسرائیلی حکومت صرف سیاسی وڈیموگریفک تبدیلی کے لئے ہی کوشاں نہیں، بلکہ وہ تہذیبی و دینی تبدیلیوں کے لئے بھی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہے، اس کی کوشش یہ ہے کہ شہر قدس کی عرب و اسلامی شناخت کو ختم کر دیا جائے، تعلیم کو یہودی رنگ دے دیا جائے، عربی شناخت کو مٹا دیا جائے اور ان سبھی کو تاریخی و دینی لحاظ سے یہودی شناخت میں تبدیل کر دیا جائے۔

چنانچہ گورنمنٹ اسکولوں میں عربی منہج تعلیم کو کالعدم قرار دے دیا گیا اور اس کی جگہ اسرائیلی منہج تعلیم کی ترویج کی گئی۔ فلسطینی میوزیم برائے آثار پر بھی قبضہ کر لیا گیا، اور ہزاروں عربی و اسلامی، علمی و تہذیبی کتابوں پر پابندی عائد کر دی گئی، نشر و اشاعت اور صحافت سے متعلق اداروں کی سخت نگرانی کی جانے لگی، اس طرح اسرائیلی تعلیمی منہج نے ہر اس چیز کو دور رکھا جو عرب تہذیب اور عرب قومیت کی بات کرتی ہو۔

الغرض اسرائیلیوں نے قدس کو یہودی رنگ میں رنگنے کے لئے جو مختلف سرگرمیاں اور کاروائیاں اختیار کر رکھی تھیں، ان میں سب سے تیزی کے ساتھ جس پر وہ عمل پیرا تھے وہ تھا تعلیم کو یہودی رنگ دینا اور اسلامی نظام قضاء کا خاتمہ کرنا۔

خلاصہ کلام

شہر قدس پر عربوں اور فلسطینیوں کے تاریخی حق (Historical Right) اور القدس کو یہودی شہر بنانے کے اسرائیلی اقدامات کے موضوع پر یہ ایک مستند اور حقیقت پر مبنی دستاویزی تالیف ہے۔ جس میں سرکاری وثائق، تصویروں اور نقشوں کے ذریعے غاصب اسرائیلی ریاست کے الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا کے ذریعے عالمی سطح پر پھیلائے ہوئے مغالطوں اور پروپیگنڈوں کا علمی و تحقیقی بنیادوں پر تعاقب کیا گیا ہے۔

مستشرقین کا تعارف، تاریخ اور اہداف (قسط دوم)

محمد اشرف مجددی

❁.....تاریخ ❁

• تحریک استشراق کا آغاز

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

صحیح بات تو یہ ہے کہ تحریک استشراق کا آغاز تو اسی عہد میمون میں ہو چکا تھا جب کہ اسلام اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ ظہور پذیر ہوا، جیسے آج اسلام جب ایک غالب قوت کی حیثیت سے ابھرتا ہوا دیکھا تو اس وقت کے مستشرقین نے اس کو روکنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور حالات کے تحت ادل بدل کر تمام تدبیریں اختیار کی۔ نہ جانے کتنے روپے دھارے۔ انہیں تدابیر میں سے ایک تدبیر وہی تھی جیسے آج کی زبان اور اصطلاحی میں استشراق کا نام دیا جاتا ہے

ہاں اس عہد میں بنام استشراق ان کی تشہیر نہیں ہوئی تھی۔ اس تشہیر کے اعتبار سے محققین کے بہت سارے نظریات ہیں۔

✓ ڈاکٹر محمود احمد محمدی زقزوق لکھتے ہیں۔

"تحریک استشراق کا آغاز 1312ء میں ہوا جب "فینا" میں کلیسا کی کانفرنس منعقد ہوئی"[7]

✓ ڈاکٹر محمد احمد دیاب لکھتے ہیں۔

"تحریک استشراق کا آغاز 13 ویں صدی عیسوی میں ہوا جب قشتالہ کے بادشاہ ""الفونس دھم"" نے 1269 میں مریسلیا میں اعلی تعلیمات کا ادارہ بنالیا[8]

---

[7] الاستشراق الخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری من 25 مطبوع دار المنار قاہرہ 1984

[8] ضوء علی الاستشراق والشرقان من 14 مطبوع دار المنار قاہرہ 1989

- ✓ اسی طرح بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس تحریک کا آغاز 12 ویں صدی عیسوی میں ہوا جب 1143 میں پطرس محترم کے اشارہ پر قرآن کا لاطینی میں ترجمہ ہوا[9]
- ✓ بعض حضرات کہتے ہیں کہ تحریک استشراق کا آغاز دسویں صدی عیسوی میں ہوا جب فرانس کا ایک راہب جریدی اور الیاک (940-1003) حصول علم کی خاص اندلس گیے[10]
- ✓ علامہ پیر کرم شاہ الازہری کے مطابق تحریک استشراق کا آغاز آٹھویں صدی میں مشرق اور مغرب کے اہل کتاب نے مل کر کیا تھا مشرق اہل کتاب کا نمائندہ یوحناد مشقی (676-749) تھا جس نے اسلام کے خلاف دو کتابیں لکھیں

1) محاورۃ مع المسلم

2) ارشادات النصاري في جدول المسلمين

یہ دونوں تصنیفات اسی مقصد کے تحت لکھی گئی تھی جس کے تحت مستشرقین نے تصنیفات کا انبار لگا دیا تھا اس لئے یوحناد مشقی کو تحریک استشراق کا نقطہ آغاز قرار دیا جاسکتا ہے[11]

- ✓ جدید مستشرقین کا نسب نامہ یا شجرہ نسب جان آف مشق 700 یا 749) سے جاملتا ہے اس نے پیغمبر اسلام اور اسلام کے خلاف نفرت اور دشمنی کی تحریک کا آغاز کیا[12]

بہر حال جو کام آج کے مستشرقین کر رہے ہیں یہی کام ان کے آباواجداد کر چکے ہیں جس طرح آج مستشرقین خدمت علم کے لبادہ میں ملبوس ہو کر دینی و مذہبی کتابوں میں تحریف و تغیر کر کے حقائق کو دیدہ دلیری کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے آنے نہیں دیتے۔ المختصر اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت۔ اسلامی پیغام کو نیست و نابود کرنا یا کم از کم ان کی حقانیت کے ارد گرد شکوک و شبہات کا حصار کھڑا کرنا جس طرح عہد رسالت میں ان کے اہداف تھے آج بھی یہی ہے البتہ حالات و مقتضیات نے ان کے طریقہ کار، تدابیر و ٹائٹل۔ میں ضرور تبدیلی پیدا کی مگر بنیادی مقاصد میں کوئی بھی تبدیلی نہیں. آئی وہ آج بھی جاری ساری ہے (جاری ہے)

---

[9] الاستشراق الخلفيه الفكريه للصراع الحضاري ص 23 مطبوعہ دار المنار شمارہ 1989

[10] ضوء على الاستشراق والمستشرقين من 13 مطبوعہ دالمنار قاہرۃ 1989

[11] ضیاء النبی جلد 6 صفحہ نمبر 127-126 مطبوعہ المجمع المصباحی مبارکپور

[12] اسلام اور مستشرقین جلد 3 صفحہ 16 مطبوعہ دار المصنفین اعظم گرہ

روحانیت، الحادیت کا رد ہے!

حافظ محمد فیصل نواز

حق و باطل ہمیشہ سے موجود رہے ہیں لیکن امت مسلمہ کو آج جتنے فتنوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اتنا ماضی میں کبھی نہیں کرنا پڑا۔ اونچائی سے بہتے تیز پانی کے دھارے کی طرح فتنے ہم پر مسلط ہو رہے ہیں گویا کہ وہی صورتحال دکھائی دے رہی ہے جو ایک روایت میں بیان ہوئی ہے کہ:

"ایک شخص صبح مومن ہوگا اور شام کو کافر یا شام کو مومن ہوگا اور صبح کافر"

لہذا آج کا دور پر فتن دور ہے اللہ تعالیٰ ہمیں ان تمام فتنوں سے محفوظ فرمائے۔ آمین!

❖ الحاد

اس پر فتن کا سب سے بڑا فتنہ یا یوں کہیے کہ فتنوں کی جڑ "فتنہ الحاد" ہے۔ الحاد کی اجمالی تعریف یہ ہے کہ:

"حق صراط مستقیم سے انحراف کرنا حق راہ کو چھوڑ کر باطل کو اختیار کرنا "الحاد" کہلاتا ہے۔ چونکہ ہر فتنہ راہ حق سے منحرف ہوتا ہے بلکہ فتنہ تو کہتے ہی اسے ہیں جو صراط مستقیم کو چھوڑ کر باطل کا راستہ دکھائے"

لہذا الحاد کی مذکورہ تعریف کے مطابق ہر فتنہ الحاد ہے جبکہ معروف اور مروجہ الحاد کا بنیادی عقیدہ انکار خدا ہے۔ ملحدین اس وحدہ لاشریک ذات کا انکار کر کے خود کو ہر مذہبی پابندی سے آزاد سمجھتے ہیں نفسیاتی لذت اور مذہب پرستی الحاد کے بنیادی مقاصد ہیں۔ ملحد خود کو ہر مذہبی قوانین سے آزاد کر کے یہ مختصر زندگی عورت اور دولت کی غلیظ لذتوں میں گزارتا ہے۔ یقیناً مذہب بالخصوص دین اسلام اس طرح کی غفلت بھری زندگی گزارنے کی مذمّت اور مزاحمت کرتا ہے لہذا ملحدین نے ایسی پابندی سے جان چھڑانے کے لیے صرف مذہب کا ہی نہیں خود وجود خدا کا ہی انکار کر دیا نا کسی قادر مطلق ذات کا وجود ماننا پڑے نہ کسی مذہبی پابندی کا سامنا کرنا پڑے اس طرح وہ عیاشی والی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ الحاد میں علم کا ذریعہ مشاہدہ یعنی (observation) ہے جو چیز نظر آئے گی اس کا یقین کیا جائے گا۔ ایمان بالغیب کا انکار کیا جاتا ہے جیسے وجود خدا، آخرت، ملائکہ، حساب و کتاب اور جنت و

دوزخ وغیرہ۔ غرض یہ کہ جس چیز کا مشاہدہ نہ کیا جاسکے اس کا انکار الحاد کا لازمی جز ہے۔ الحاد روز بروز پھیلتا جارہا ہے آزاد خیالی، نفس پرستی اور مذہب کے حوالے سے متعصبانہ سوچ الحاد کے مشہور اسباب ہیں، ملحدین کے نزدیک یہ کائنات ایک بے شعور مادے سے "خود بخود" وجود میں آگئی جس کا مشاہدہ خود ملحدین نے بھی نہیں کیا۔

❖ روحانیت:

روحانیت مادیت کی ضد ہے چونکہ الحاد کی بنیاد مادہ اور مادہ پرستی پر ہے لہذا روحانیت الحادیت کی ضد ہوئی اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روحانیت کسے کہتے ہیں؟

اس حوالے سے مولانا آصف اقبال مدنی فرماتے ہیں کہ:

"لفظ روحانیت روح سے بنا ہے اور روح کے معنی ہیں "راحت، سکون و قرار

"لہذا روحانیت کا مطلب بنے گا ایسا عمل جس سے سکون حاصل کیا جائے"

(بحوالہ روحانیت کا درست مفہوم)

انسان کے دو وجود ہیں ایک مادی وجود (ظاہری) بدن۔ اس کو تندرست رکھنے کے لیے مخصوص غذا کا استعمال ضروری ہے مزید اس کو نیند اور ورزش سے تندرست رکھا جاسکتا ہے لیکن ان طریقوں سے انسان کو "دائمی" سکون، چین اور اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا کیونکہ دلی اور دائمی سکون کا تعلق انسان کے اس وجود سے ہے جس کو روحانی وجود کہتے ہیں جس کا تعلق ہماری روح کے ساتھ ہے۔ جس طرح مادی وجود کی ایک خاص غذا ہے جس سے انسان کا ظاہری بدن تندرست رہتا ہے اسی طرح روحانی جسم کی بھی ایک خاص غذا ہے اگر وہ غذا دستیاب نہ ہو تو یہ روحانی وجود بے چین اور کمزور پڑ جاتا ہے۔ ملحدین عورت، دولت، ظلم و ستم اور دیگر گناہوں کی لذتوں سے سکون حاصل کرنا چاہتے ہیں اگر روح کی یہی غذا ہوتی تو ملحدین "دائمی" طور پر پُر سکون ہوتے لیکن حقیقت میں ملحدین شک (کنفیوژن) اور بے مقصد بھری زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

روحانیت کا تعلق ظاہری مادے سے نہیں ہے۔ روحانیت روحانی عقائد و اعمال سے ہی حاصل ہو گی مثلاً روحانیت (دلی راحت و سکون) بھی تب حاصل ہو گا جب یہ یقین کیا جائے گا کہ یہ کائنات خود بخود نہیں بنی بلکہ اس کو ایک عظیم ذات نے عدم سے وجود بخشا ہے جس کو "رب تعالیٰ" کہا جاتا ہے۔ روحانیت تب ہی حاصل ہو گی جب اس بات پر یقین رکھا جائے کہ ہمارا وجود بے مقصد نہیں ہے بلکہ اس کو رب نے اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔

روحانی سکون تب ہی حاصل ہو گا جب اس عقیدے پر پختہ یقین ہو کے مرنے کے بعد ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا اور ہمارے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔

اچھے اعمال پر جنت (دائمی انعام) ملے گی اور برے اعمال کے بدلے عذاب دیا جائے گا لہذا اس سوچ کے ساتھ وہ شخص دنیا میں شک کا شکار نہیں ہو گا، کبھی بے راہروی کا شکار نہیں ہو گا اور کبھی گناہوں اور نفسیاتی لذتوں کی طرف نہیں لپکے گا جب اس ذہن میں مرنے کے بعد حساب دینے کا خوف ہو گا تو ایک بامقصد زندگی گزارے گا۔ ظلم و ستم، لوٹ کھسوٹ اور مادہ پرستی آخرت کے خوف سے زائل ہو جائے گی۔ اسی طرح ایک شخص اپنی روحانی غذا حاصل کر کے ایک روحانی زندگی گزارتا ہے۔

اسی طرح روحانیت (دلی سکون) اللہ تعالیٰ کے ذکر میں رکھی گئی ہے انسان فرائض کے بعد نوافل کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرتا ہے انسان جتنا اللہ کے قریب ہوتا ہے اتنا ہی روحانی شخصیت کا حامل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو پانے کا ایک ذریعہ اولیاء اللہ کی صحبت کا اختیار کرنا بھی ہے۔

جیسے شاعر نے کہا کہ:

؎ اللہ اللہ کیے جانے سے اللہ نہ ملے

یہ تو اللہ والے ہیں جو اللہ سے ملا دیتے ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ انسان جتنا روحانی ہوتا ہے اتنا مادہ پرستی سے دور ہوتا ہے۔

❖ روحانیت سے الحادیت کا علاج:

آپ دونوں (روحانیت اور الحادیت) کا موازنہ پڑھ چکے ہیں اب یہ فیصلہ کرنا آسان ہو گیا کہ

- ✓ مادہ پرستی سے نجات کا طریقہ کیا ہے؟
- ✓ مادیت کا رد کیا ہے؟
- ✓ الحاد سے نجات کیسے ممکن ہے؟

واضح ہوا کہ الحادیت کی بنیاد مادیت ہے اور مادیت کی ضد روحانیت ہے لہذا ثابت ہوا کہ

"روحانیت الحادیت کا رد ہے"۔

- مادہ پرست (ملحد) نفسیاتی خواہش سے وقتی لذت تو حاصل کر سکتا ہے لیکن اس کو دائمی سکون اور راحت نصیب نہیں ہوتی کیونکہ دائمی سکون اور راحت صرف روحانیت میں ہے۔ روحانیت صرف مذہب اسلام کو ماننے اور اس کے احکامات پر عمل کرنے سے حاصل ہو گی۔
- الحادیت میں انسان شک کی وادی میں کھویا رہتا ہے جبکہ روحانیت میں انسان کو یقین کامل حاصل ہوتا ہے۔ الحادیت ایک بے مقصدیت کا نام ہے جبکہ روحانیت ایک ہی بارگاہ میں سربسجود ہو کر (دائمی انعام) جنت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔
- الحادیت میں وقتی جسمانی لذت اور دائمی بے چینی اور بے سکونی کا سامنا ہے جبکہ روحانی دنیا میں وقتی جسمانی مشقت کے ساتھ دائمی (ہمیشہ کا) سکون، راحت اور کامیابی کی خوشخبری ہے۔ الحادیت میں ظلم و ستم اور لوٹ کھسوٹ ہے جبکہ روحانیت میں انصاف ایسا کہ بروز قیامت ایک ایک پائی کا حساب لیا جائے گا۔
- روحانیت میں ایک مقصدیت ہے انسان ایک واضح نظریے کے تحت ایک پر سکون زندگی گزارتا ہے جبکہ الحادیت میں ایک ملحد کی زندگی ایک جانور کی زندگی کے مانند بے مقصدیت، غیر یقینی کیفیت، بے سکونی میں اور وقتی لذت کے حصول میں بسر ہوتی ہے۔

لہذا ثابت ہوا کہ الحادیت ہر فساد کی جڑ اور اصل ہے جبکہ روحانیت ہر الحادی مرض کا علاج ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ پاک ہمارا خاتمہ بالایمان فرمائے آمین ثم آمین!

خلافتِ عباسیہ (مستشرق مؤرخ۔ول ڈیورنٹ کی نظر میں)

محمد حسن علی

تاریخ درحقیقت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسان ماضی کی ریاستوں، سلطنتوں، خلافتوں اور اہم شخصیات کے حالات و واقعات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔یہی تاریخ انسان کو غیر جانبداری کے ساتھ ماضی کے واقعات کا تجزیہ کرنے اور ان سے سبق سیکھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔تاریخ ہی کے ذریعے انسان عظیم سلطنتوں کی شان و شوکت اور ان کے زوال و عروج کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

اگر غیر جانبدار ہو کر تاریخِ اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو ہم اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ خلافتِ عباسیہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا وہ درخشاں دور ہے، جس نے علمی، فکری اور تہذیبی ارتقاء کی منازل اس تیزی سے طے کیں کہ تاریخ میں اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔خلافتِ عباسیہ کو اپنے نقطۂ عروج پر پہنچانے والے خلفاء میں بالخصوص ہارون الرشید اور مامون الرشید کا نام نمایاں ہے، جن کی علم دوستی، دانشورانہ سرپرستی اور علمی مراکز کی سرپرستی نے اس خلافت کو علم و فضل، طب، فلسفہ، فنِ تعمیر، آرٹ اور شاعری کا مرکز بنا دیا۔

(خلافتِ عباسیہ کا جغرافیائی نقشہ)

عباسی دور میں اسلامی تہذیب پر عرب کے ساتھ ساتھ عجم یعنی ایرانی اثرات بھی نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں، اور یہ اثرات خلافت کے ابتدائی دور یعنی سفاح سے لے کر مامون الرشید تک واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب کا سنہری دور خلافتِ عباسیہ کو کہا جاتا ہے—اور نہ صرف مسلم مورخین بلکہ غیر مسلم مستشرقین بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔

ول ڈیورانٹ (1885ء تا 1981ء) کا مختصر تعارف

ول ڈیورانٹ ایک مؤرخ، فلسفی اور سیاست کے ماہر تھے، لیکن ان کی اصل وجہِ شہرت "The Story of Civilization" بنی، جو کل 11 جلدوں پر مشتمل ہے۔ ول ڈیورانٹ شمالی ایڈمز، میساچوسٹس میں پیدا ہوئے۔ اس سلسلے کی ابتدائی سات جلدیں ول ڈیورانٹ نے خود تحریر کیں،

جبکہ باقی جلدیں انہوں نے اپنی اہلیہ ایریل ڈیورانٹ کے ساتھ مل کر مکمل کیں۔ ول کے والدین عیسائی تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا ایک عیسائی پادری بنے۔ 1907ء میں ول ڈیورانٹ نے سینٹ پیٹرز کالج، نیو جرسی سے گریجویشن کیا۔ اسی دوران انہیں ایک اسکول میں ملازمت ملی، جہاں ان کی ملاقات ایریل نامی لڑکی سے ہوئی، جس کی عمر اُس وقت پندرہ برس تھی۔

بعد ازاں دونوں نے شادی کر لی۔ شادی کے بعد ول ڈیورانٹ نے ملازمت چھوڑ دی اور یورپ کا سفر کیا۔ واپسی پر وہ ایک گرجا گھر میں لیکچرار بن گئے۔ انہی لیکچرز کے نوٹس بعد میں "The Story of Civilization" کی بنیاد بنے۔

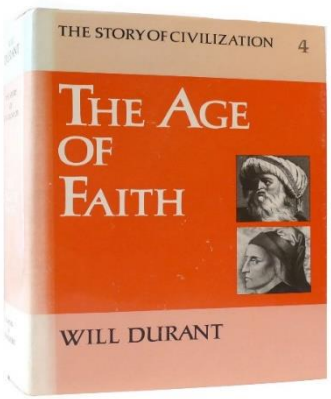

ول ڈیورانٹ نے تاریخ، فلسفہ، سماجیات اور سیاسیات جیسے موضوعات پر عوامی فہم و شعور کو بہتر بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ "The Story of Philosophy" کی مقبولیت کے بعد ول اور ایریل نے دیگر مشاغل ترک کر کے مکمل طور پر "The Story of Civilization" لکھنے میں خود کو وقف کر دیا۔

ول ڈیورنٹ کا اسلوبِ تحریر

ول ڈیورانٹ ایک غیر معمولی مصنف تھے، جن کی تحریر میں ہزارہا صفحات پر بھی وضاحت، دلکشی اور شائستگی کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے تقریباً ہر موضوع اور ہر عہد کا احاطہ کیا۔ مابعد الطبیعات ہو یا تجارتی نظام، مصوری ہو یا قانون یا پھر قدیم انجینئرنگ—ڈیورانٹ ہر موضوع پر قلم اٹھاتے اور اسے زندگی بخشتے چلے گئے۔

- ✓ ان کا اسلوب عام فلسفیوں اور مؤرخوں سے مختلف تھا؛ وہ تحریر کے دوران سن و سال گنوانے کے قائل نہ تھے۔ ان کی نثر میں ایسی روانی اور دلکشی ہے کہ قاری جتنا پڑھتا ہے، اتنا ہی آگے پڑھنے کی خواہش جاگ اٹھتی ہے۔
- ✓ ول ڈیورانٹ کی تحریروں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی سادہ، عام فہم اور رواں زبان ہے، لیکن اس سادگی میں بلا کی شاعری، ادیبانہ تکلم اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ ان کے جملوں میں ادبی حسن اور الفاظ کی موسیقیت اس قدر رچی بسی ہوتی ہے کہ قاری اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

Civilization is a stream with banks.
The stream is sometimes filled with blood from people killing, stealing, shouting and doing the things historians usually record — while, on the banks, unnoticed, people build homes, make love, raise children, sing songs, write poetry."[13]

ترجمہ:

"تہذیب ایک دریا کی مانند ہے جس کے کنارے ہوتے ہیں۔ یہ دریا بعض اوقات خون سے بھر جاتا ہے—جب لوگ قتل و غارت کرتے ہیں، چوری کرتے ہیں، چیختے چلاتے ہیں اور وہ سب کچھ کرتے ہیں

[13] HISTORIAN WILL DURANT DIES; AUTHOR OF 'CIVILIZATION' SERIES By United Press International Nov. 9, 1981

جسے مؤرخ عموماً قلم بند کرتے ہیں — لیکن اس دوران کناروں پر لوگ خاموشی سے گھر بناتے ہیں، محبت کرتے ہیں، بچوں کی پرورش کرتے ہیں، گیت گاتے ہیں اور شاعری کرتے ہیں۔"

- ✓ ول ڈیورانٹ کے اسلوب کی ایک اور نمایاں خوبی اس کی جامعیت ہے۔ وہ انسانی فطرت، سیاست، معیشت اور ثقافت کے باہمی ربط کو ایک ہی فریم میں اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ ہر پہلو ایک دوسرے سے جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے جملے مختصر مگر معنی خیز ہوتے ہیں، جن میں فکری گہرائی اور معنوی وسعت پوشیدہ ہوتی ہے۔

اس کی مثال یہ جملہ ہے:

History is mostly guessing; the rest is prejudice. [14]

ترجمہ:

"تاریخ زیادہ تر قیاس آرائی پر مبنی ہوتی ہے؛ باقی تعصبات ہوتے ہیں۔"

اس ایک جملے میں ڈیورانٹ نے نہایت سادہ مگر کاٹ دار اسلوب میں تاریخ کی حقیقت بیان کی ہے۔ وہ مؤرخین کے تعصبات اور اندازوں پر تنقید کرتے ہوئے قاری کو دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ وہ خود تحقیق کرے اور حقیقت کی کھوج میں لگے۔

- ✓ ول ڈیورانٹ کے اسلوب میں جابجا تشبیہات و استعارات کا خوبصورت استعمال نظر آتا ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھیے، جہاں وہ مسجد کو مردانہ طاقت اور زنانہ نزاکت سے تشبیہ دیتے ہیں:

"So illuminated, Islamic architecture raised in Arabia, Palestine, Syria, Mesopotamia, Persia, Transoxiana, India, Egypt, Tunisia, Sicily, Morocco, and Spain an endless chain of mosques in which masculine strength of outward form was always balanced by feminine grace and delicacy of interior ornament."[15]

ترجمہ:

---

[14] Durant, Our Oriental Heritage, 12

[15] Durant, The age of faith,273

"عرب، فلسطین، شام، میسوپوٹیمیا، فارس، ورائے جیحون، ہندوستان، مصر، تیونس، صقلیہ، مراکش اور اسپین میں اسلامی فنِ تعمیر نے شان دار انداز میں جلوہ گری کی، جہاں مساجد کے بیرونی ڈھانچے کی مردانہ طاقت اور شکوہ کو اندرونی تزئین و آرائش کی زنانہ نزاکت اور لطافت کے ساتھ ہم آہنگ کیا گیا۔"

✓ یوں ول ڈیورانٹ کی تحریر میں فکری وسعت، ادبی حسن، معنوی گہرائی اور اسلوبی دلکشی کا حسین امتزاج نظر آتا ہے، جو ہر قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اسے مزید پڑھنے پر آمادہ کرتا ہے۔

اسلامی تہذیب، خلافتِ عباسیہ اور ول ڈیورنٹ

ول ڈیورنٹ نے اسلامی خلافت کو تاریخِ انسانی کی ایک شاندار اور مثالی سیاسی و تمدنی قوت قرار دیا ہے۔ وہ خلافتِ راشدہ، اموی اور عباسی ادوار کو علم، فلسفہ، فنون اور معیشت کے اعتبار سے نہایت زرخیز اور روشن زمانے قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق اسلامی تہذیب نے نہ صرف عرب دنیا بلکہ یورپ، ایشیا اور افریقہ تک علم، تحقیق اور تہذیب کے چراغ روشن کیے۔

ول ڈیورنٹ اس حقیقت کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ دراصل اسلامی علوم و فلسفہ کی مرہونِ منت تھی۔ وہ اسلامی تہذیب کی عظمت، شان و شوکت اور اس کے اثرات کو تسلیم کرتے ہوئے اسے دنیا کی سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی تہذیبوں میں شمار کرتے ہیں۔ ان کے بقول، پانچ صدیوں تک اسلام دنیا کی سب سے ترقی یافتہ تہذیب رہا، جس نے علم، فلسفہ، سائنس، فنون، انسان دوستی، عدل اور مساوات کی عملی مثال قائم کی۔

ول ڈیورنٹ اس تاریخی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"For five centuries, from 700 to 1200, Islam led the world in power, order, and extent of government, in refinement of manners, in standards of living, in humane legislation and religious tolerance, in literature, scholarship, science, medicine, and philosophy."[16]

[16] (Ibid.,341

ترجمہ:

"700ء سے 1200ء تک پانچ صدیوں کے دوران اسلام نے طاقت، نظم و نسق، حکومت کے دائرہ کار، انداز و اطوار کی شائستگی، معیارِ زندگی، انسان دوست قانون سازی، مذہبی رواداری، ادب، علم و حکمت، سائنس، طب اور فلسفہ کے میدان میں دنیا کی قیادت کی۔"

ول ڈیورنٹ اس امر کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے پسِ منظر میں اسلامی تہذیب ہی کارفرما تھی۔ مسلمانوں نے یونانی و رومی فلسفے کو محفوظ کر کے یورپ تک پہنچایا، اور ارسطو و افلاطون کے افکار کو دوبارہ زندہ کیا۔ اس علمی و فکری احیاء میں مسلم فلسفیوں، مترجمین اور ماہرین کا بنیادی کردار تھا۔

خصوصاً خلیفہ مامون کے دور میں بغداد کے بیت الحکمہ میں مترجمین کی ایک بڑی جماعت سرگرمِ عمل تھی، جو یونانی اور دیگر قدیم کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر رہی تھی۔ یہی علمی سرمایہ بعد ازاں یورپ میں علمی و فکری تحریک کا پیش خیمہ بنا۔

اس حوالے سے ممتاز مؤرخ ٹومسٹ گولڈ سٹین لکھتے ہیں:

"Every single specialized science in the West owes its origin to the Islamic impulse, or at least its direction from that time on. It was from Islam that the Middle Ages learned to look on nature as an infinitely varied reality, not as a philosophical idea."[17]

ترجمہ:

" مغرب میں ہر مخصوص سائنسی شعبہ اپنی ابتدا، یا کم از کم اُس دور کے بعد اپنی سمت، اسلامی تحریک کا مرہونِ منت ہے۔ قرونِ وسطیٰ نے فطرت کو ایک فلسفیانہ تصور کے بجائے ایک لامتناہی متنوع حقیقت کے طور پر دیکھنا اسلام ہی سے سیکھا۔"

ول ڈیورنٹ تہذیبوں کے زوال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

[17] Thomas Goldstein, Dawn ofModern Science, 99

A great civilization is not conquered from without until it has destroyed itself within."[18]

ترجمہ:

"ایک عظیم تہذیب کو باہر سے اُس وقت تک فتح نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ وہ خود اندر سے تباہ نہ ہو جائے۔"

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اسلامی تہذیب کے زوال کا سبب منگولوں کا حملہ نہیں تھا، بلکہ ابن العلقمی جیسے بد کردار وزیروں اور اندرونی سازشوں نے اس شاندار تہذیب کو کمزور کیا۔ یہی داخلی کمزوریاں اور فکری جمود اسلامی دنیا کی عظمت کے اختتام ہونے کا سبب بنے۔

خلافتِ عباسیہ کی علمی خدمات

ول ڈیورنٹ نے اپنی کتاب The Age of Faith (چوتھی جلد) میں عباسی دور کو اسلامی تہذیب کا سنہری دور قرار دیا ہے۔ وہ اسے علم، فلسفہ، طب، ریاضی، فلکیات اور ادب سمیت تمام علوم و فنون کی غیر معمولی ترقی کا زمانہ گردانتے ہیں، اور بغداد کو اس دور کا سب سے بڑا علمی و ثقافتی مرکز تصور کرتے ہیں۔

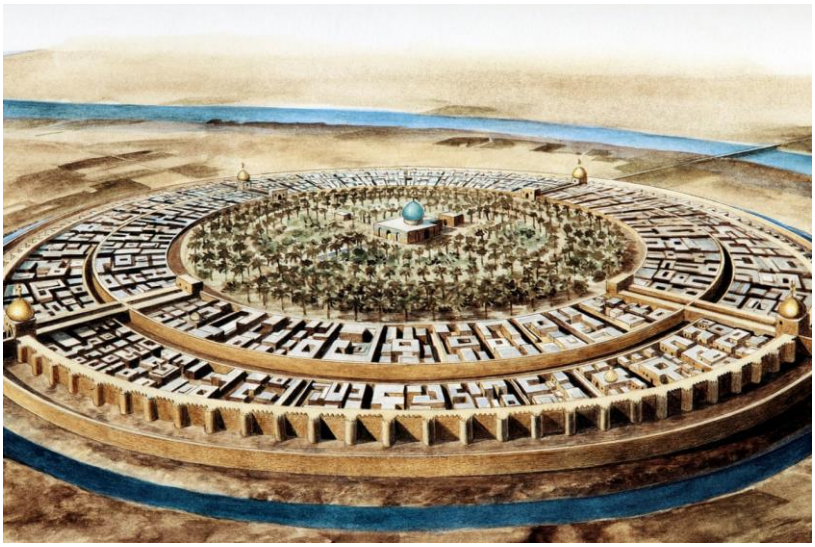

(دسویں صدی عیسوی میں بغداد شہر کا نقشہ)

[18] (Durant, Caesar and Christ,665

اس حوالے سے ول ڈیورنٹ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو، جو اس دور کی عظمت اور تہذیبی عروج کی بھرپور عکاسی کرتا ہے:

"Only at the peaks of history has a society produced, in an equal period, so many illustrious men — in government, education, literature, philology, geography, history, mathematics, astronomy, chemistry, philosophy, and medicine — as Islam in the four centuries between Harun al-Rashid and Averroës[19]."

ترجمہ:

"تاریخ کے بلند ترین ادوار میں شاذ ہی کسی تہذیب نے اتنے کم عرصے میں اتنے جلیل القدر افراد پیدا کیے ہوں، جتنے اسلام نے ہارون الرشید سے لے کر ابن رشد تک چار صدیوں کے دوران حکومت، تعلیم، ادب، لسانیات، جغرافیہ، تاریخ، ریاضی، فلکیات، کیمیا، فلسفہ اور طب جیسے میدانوں میں پیدا کیے۔"

عباسی دور میں "بیت الحکمت" جیسے عظیم ادارے قائم کیے گئے، جہاں دنیا بھر کے علوم وفنون پر موجود قدیم کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس ادارے نے نہ صرف قدیم علم کو محفوظ کیا بلکہ اسے نئی زندگی عطا کی۔ یونانی فلسفیوں ارسطو اور افلاطون کے افکار کو دوبارہ زندہ کیا، اور ان کے فلسفے پر علمی تنقید و تحقیق کی۔ ان علوم کی تدوین و تشریح نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کی بنیادیں بھی فراہم کیں۔ عباسی خلافت کا یہ عہد واقعی اسلامی تہذیب کا عروج اور دنیا کے علمی و فکری ارتقاء کا روشن ترین باب تھا۔

چنانچہ ایک مستشرق کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

During those five "golden" centuries, Muslim realms became the world's unrivaled intellectual centers of science, medicine, philosophy, and education. The Abbasids championed

[19] durant,age of faith,page343

the role of knowledge and are renowned for such enlightened achievements as creating a "House of Wisdom" in Baghdad.[20]

ترجمہ:

ان پانچ "سنہری" صدیوں کے دوران، مسلم سلطنتیں سائنس، طب، فلسفہ اور تعلیم کے شعبوں میں دنیا کی بے مثال علمی مراکز بن گئیں۔ عباسی حکمرانوں نے علم کے فروغ کا بھرپور ساتھ دیا اور بغداد میں "دارالحکمت" جیسے روشن خیال کارنامے انجام دینے کے لیے مشہور ہوئے.

خلافتِ عباسیہ اور علم و فضل

خلافتِ عباسیہ علم و فضل میں اپنی مثال آپ تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ خلفا کی علم دوستی، علما کی سرپرستی اور اہلِ علم کو انعام و اکرام سے نوازنا تھا۔ اس دور میں تعلیم عام طور پر مفت یا اتنی کم قیمت پر فراہم کی جاتی کہ ہر طبقے کے لوگ اسے حاصل کر سکتے تھے۔ نصاب سادہ اور بامقصد ہوتا، جس میں الہیات، تاریخ، اخلاقیات، قانون اور ریاضی اعلیٰ تعلیم کا حصہ تھے۔

عباسی خلفا کی علم دوستی اور اساتذہ کے احترام کا اندازہ اس واقعے سے بھی ہوتا ہے:

Said Harun to the tutor of his son Amin: "Be not strict to the extent of stifling his faculties, nor lenient to the point of... accustoming him to idleness. Straighten him as much as thou canst through kindness and gentleness, but fail not to resort to force and severity should he not respond."[21]

ترجمہ:

[20] Islam: A Mosaic, Not a Monolith, 2003,p 27

[21] durant,age of faith,page 235

"ہارون نے اپنے بیٹے امین کے اتالیق سے کہا: اتنی سختی نہ کرنا کہ اس کی صلاحیتیں دب کر رہ جائیں، نہ ہی اتنی ڈھیل دینا کہ وہ آوارہ گردی کا عادی بن جائے۔ مہربانی اور شفقت کے ذریعے جہاں تک ممکن ہو اسے سیدھا کرنا، لیکن اگر وہ صحیح راہ پر نہ آئے تو مارنے پیٹنے اور سختی سے گریز نہ کرنا۔"

ابتدائی تعلیم کا مقصد کردار سازی ہوتا، جبکہ ثانوی تعلیم کا محور علم کی ترسیل اور فکری بالیدگی ہوتا۔ ابتدا میں مساجد ہی درسگاہیں تھیں، جہاں علما قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم دیتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ سرکاری سرپرستی میں باقاعدہ مدارس قائم ہوئے، جن میں ادب، ریاضی اور فلکیات جیسے علوم بھی شامل کر دیے گئے۔

عربی زبان کو خاص اہمیت حاصل تھی، کیونکہ وہ فصاحت، بلاغت اور علم کا معیار سمجھی جاتی تھی۔ تدریس بلا معاوضہ کی جاتی اور اکثر طلبہ کے لیے قیام و طعام کا انتظام بھی مفت ہوتا۔ طلبہ کتابوں سے زیادہ اہلِ علم کی صحبت اور مجلس کو ترجیح دیتے اور حصولِ علم کے لیے مکہ، بغداد، دمشق اور قاہرہ جیسے علمی مراکز کا سفر کرتے۔

رسمی اسناد کا رواج نہ تھا؛ استاد کی زبانی منظوری ہی سند کی حیثیت رکھتی تھی۔ علم کا منتہا خوش گفتاری، حاضر دماغی اور ذوقِ ادب میں مہارت سمجھا جاتا تھا۔

خلافتِ عباسیہ اور فلسفہ و سائنس

عباسی دور کی درخشاں صدیوں میں مسلمانوں نے علم و حکمت کے حصول کے لیے زبردست محنت کی۔ عباسی خلفا نے یونانی سائنس اور فلسفہ کی اہمیت کو پہچانا اور سکندریہ، انطاکیہ، بیروت اور جندی شاپور جیسے مراکزِ علم کو محفوظ رکھا۔

ان مدرسوں میں شامی زبان میں محفوظ یونانی علوم کو عربی میں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ خلیفہ المأمون نے بغداد میں "بیت الحکمت" قائم کیا، جہاں سائنس، فلسفہ اور طب کی ہزاروں کتب کا ترجمہ ہوا۔ حنین بن اسحاق اور ان کے بیٹے اسحاق بن حنین نے ارسطو، افلاطون، جالینوس اور بطلیموس جیسے یونانی مفکرین کی اہم کتب ترجمہ کیں۔

ول ڈیورنٹ اس علمی سرگرمیوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

830"al-Mamun established at Baghdad, at a cost of 200,000 dinars ($950,000), "House of Wisdom" (Bayt al-Hikmah) as a scientific academy, an observ- atory, and a public library; here he installed a corps of translators, and paid them from the public treasury. To the work of this institution, thought Ibn Khaldun, Islam owed that vibrant awakening which in causes-the exten-sion of commerce and the rediscovery of Greece-and results-the flowering of science, literature, and art"[22]

ترجمہ:

830ء میں المامون نے بغداد میں دو لاکھ دینار کی لاگت سے "بیت الحکمۃ" بطور سائنسی اکیڈمی قائم کیا۔ اس کے علاوہ ایک رصد گاہ اور عوامی کتب خانہ بھی بنوایا یہاں مترجمین کی پوری ایک فوج بھرتی کی گئی جنہیں شاہی خزانے سے ادائیگی کی جاتی۔ "ابن خلدون کے خیال میں اس ادارے کا کیا ہوا کام ہی اسلام کی پرجوش بیداری کی بنیاد تھا، اور اسی کے نتیجے میں سائنس، ادب اور آرٹ کو بے حد فروغ ملا۔"

یونانی فلسفہ مسلمانوں تک نو فلاطونی تشریحات کے ذریعے پہنچا اور بیشتر مسلم مفکرین نے اسے قرآن کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی۔ اس علمی ورثے میں ہندوستان کا بھی کردار رہا۔ 773ء میں المنصور کے حکم پر ہندوستانی فلکیاتی کتابیں ترجمہ ہوئیں اور عربی اعداد کا نظام وجود میں آیا۔ الخوارزمی نے الجبرا اور ریاضی میں انقلاب برپا کیا اور اُس کا کام بعد میں یورپی جامعات کا نصاب بنا۔ المامون نے بطلیموس کے نظریات کو جانچنے اور زمین کے محیط کی پیمائش کے لیے ماہرین فلکیات کی خدمات حاصل کیں۔ ان کی پیمائش جدید اندازوں سے محض معمولی فرق رکھتی تھی۔ ابو الفرغانی اور البتانی جیسے علماء کے فلکیاتی مشاہدات صدیوں تک مسلم اور یورپی دنیا میں مستند رہے۔ مسلمانوں نے اصطرلاب اور دیگر فلکیاتی آلات میں جدت پیدا کی، جو بعد میں یورپ میں منتقل ہوئے۔

[22] Ibid,page,240

دورعباسیہ میں فلسفہ اور فلسفیانہ ماحول اتنا تھا کہ ول ڈیورنٹ اس ماحول کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

now for three centuries Islam played the new game of logic, drunk like the Athenian youth of Plato's time with the "dear delight" of philosophy.[23]

ترجمہ:

"اب اسلام نے تین صدیوں تک منطق کا نیا کھیل کھلا عہد افلاطون کے ایتھنسی نوجوان کی طرح فلسفہ کی "حسین مسرت" سے لطف اٹھایا۔"

خلیفہ المامون نے ان کی باتوں کو پسند کیا اور فلسفے کو سرکاری حمایت دی۔ لیکن کچھ عرصے بعد خلیفہ المتوکل آیا، جس نے ان سب باتوں پر پابندی لگادی۔ فلسفے اور عقل سے زیادہ صرف عقیدے پر زور دیا گیا۔

اس دوران الکندی اور الفارابی جیسے بڑے فلسفی پیدا ہوئے۔ الکندی نے سائنس، ریاضی اور فلسفے پر بہت کام کیا اور کہا کہ ہر انسان کو سیکھنے کا حق ہے۔ الفارابی نے بھی فلسفے، منطق اور علم کی درجہ بندی کی اور علم کو بہتر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی۔ الفرابی کی مابعد الطبیعات کی شرح کی تعریف میں اس طرح لکھتے ہیں:

He tells us that he read Aristotle's Metaphysics forty times without understanding it, and that when al-Farabi's commentary enabled him to comprehend the book he was so happy and grateful that he rushed into the street and scattered alms."[24]

ترجمہ:

"وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اُس نے ارسطو کی مابعد الطبیعیات 'چالیس مرتبہ پڑھی مگر سمجھ نہ سکا؛ اور جب الفارابی کی لکھی ہوئی شرح نے کتاب کو سمجھنا ممکن بنادیا تو وہ خوشی کے مارے بازار میں نکل گیا اور خیرات بانٹی۔"

پھر ابوالحسن الاشعری نے (معتزلی) فلسفے کے خلاف منطق سے ہی دلائل دے کر قدیم اعتقادات کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ رفتہ رفتہ علما نے فلسفے پر بات کرنا چھوڑ دیا اور فقہی مسائل میں الجھ گئے۔

خلافتِ عباسیہ اور طب (میڈیکل)

[23] lbid p,250

[24] lbid page,255

اسلامی دنیا نے جہاں علم، فلسفہ اور فنون میں گراں قدر خدمات انجام دیں، وہیں طب کے میدان میں بھی ناقابلِ فراموش کارنامے سرانجام دیے۔ عرب شروع میں محض قدیم طبّی علوم اور آلات کے ساتھ شام و فارس میں داخل ہوئے، مگر دولت و علم کی فروانی کے ساتھ وہ طب کی بلندیوں پر جا پہنچے۔ چونکہ انسانی جسم کی چیر پھاڑ مذہب میں ممنوع تھی، اس لیے علمِ التشریح کا زیادہ انحصار جالینوس کے نظریات اور زخمیوں کے مشاہدے پر رہا.

عباسیوں نے طبابت میں دواسازی اور علاج معالجے میں کمال حاصل کیا۔ انہوں نے قدیم ادویات میں عنبر، کافور، سنا اور دار چینی کا اضافہ کیا، نئے فارماسیوٹیکل طریقے اپنائے اور شربت، عرق اور جلاب جیسی ایجادات کیں۔ مشرقِ قریب سے اطالوی تجارت کا ایک بڑا حصہ عربی ادویات کی درآمد پر مشتمل تھا۔ مسلمانوں نے اولین دواخانے اور ہسپتال قائم کیے اور فارماکولوجی پر بے مثال مقالے لکھے۔ بخار، چیچک، اور خسرہ کے علاج دریافت کیے، بھاپ اور خوشبو والے غسل متعارف کروائے، اور بے ہوشی کے لیے حشیش کا استعمال بھی کیا۔ بغداد میں درجنوں شفاخانے قائم ہوئے، جن میں طبّی تعلیم اور تحقیق ہوتی۔ قانون کے مطابق بغیر ڈپلومہ کوئی شخص طبابت کا اہل نہ تھا۔

The Moslems established the first apothecary shops and dispensaries,founded the first medieval school of pharmacy[25].

ترجمہ:

"مسلمانوں نے اولین دواخانے اور ڈسپنسریاں کھولیں، قرونِ وسطی کے پہلے مکتب ادویہ سازی کی بنیاد رکھی." انھی سرزمینوں سے ابو بکر محمد الرازی اور ابن سینا جیسے عظیم طبیب اور فلسفی پیدا ہوئے۔ الرازی نے طب کی ہر شاخ پر درجنوں کتب لکھیں۔ اس کی کتاب الحاوی یورپ میں سات سو سال نصاب کا حصہ رہی اور چیچک و خسرہ پر اس کا مقالہ ایک سائنسی معجزہ سمجھا گیا۔ پیشاب کے تجزیے سے تشخیص کا اصول بھی اسی کا عطیہ تھا۔

Al-Razi was by common consent the greatest of Moslem physicians, and the greatest clinician of the Middle Age.[26]

ترجمہ:

---

[25] Ibid page 245,246

[26]) Ibid,247

"متفقہ رائے کے مطابق الرازی مسلم طبیبوں میں، اور قرون وسطی کے ماہرین طبی علاج میں بھی عظیم ترین تھا۔"

دوسری جانب ابن سینا علم وحکمت کا آفتاب تھا۔ دس برس کی عمر میں قرآن اور ادب کا ماہر بن گیا۔ سترہ برس کی عمر میں بخارا کے سلطان کا علاج کر کے شہرہ حاصل کیا۔ پھر دربدر کی ٹھوکریں کھاتا، قید وجلاوطنی سہتا، لیکن علم کی شمع روشن رکھتا رہا۔ اس نے اپنی عمر کے شب وروز مطالعے، تدریس اور تدبیر میں گزارے۔ القانون فی الطب جیسی شاہکار کتاب تصنیف کی، جو صدیوں تک مشرق ومغرب میں طب کا بنیادی حوالہ بنی رہی۔

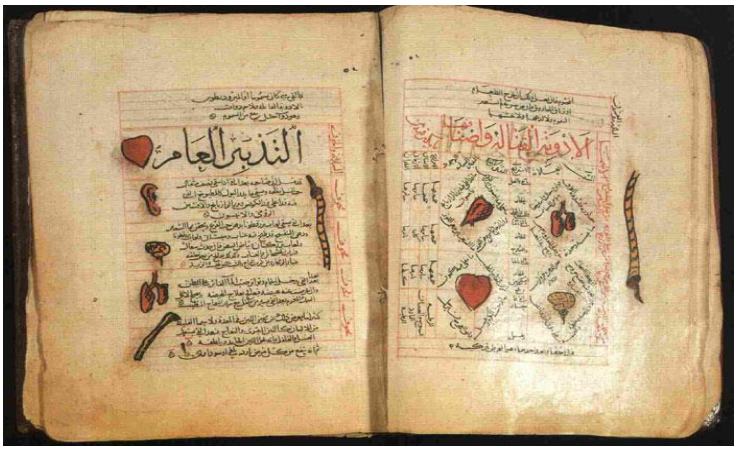

(طب اور دواسازی کے موضوع پر ابن سینا کی مشہور زمانہ انسائیکلوپیڈیا::القانون فی الطب::)

Avicenna was the greatest writer on medicine, al-Razi the greatest physi- cian, al-Biruni the greatest geographer, al-Haitham the greatest optician, Jabir probably the greatest chemist, of the Middle Ages[27])

ترجمہ:

"قرون وسطی میں ابن سینا طب پر لکھنے والا عظیم ترین محقق، الرازی عظیم ترین طبیب، البیرونی عظیم ترین جغرافیہ دان الہیثم عظیم ترین ماہر چشم، جابر بن حیان غالباً عظیم ترین کیمیا دان تھا"

[27] Ibid,248

یوں عباسیوں نے طب میں نہ صرف ادویات اور علاج کی دنیا بدل دی، بلکہ علم، انسانیت اور حکمت کے وہ نقوش چھوڑے جو رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔

یونان کے پرانے فلسفے اور منطق کی کتابیں پہلے مسیحی شام میں پہنچیں، وہاں سے مسلمانوں کے ہاتھ لگیں۔ مسلمانوں نے ان پر خوب غور کیا، ترجمے کیے اور نئی سوچ کے دروازے کھولے۔

خلافتِ عباسیہ اور آرٹ و لٹریچر

مختصر کہانیوں کی روایت تو آدم کے دور سے جاری تھی، لیکن دانشوروں نے انہیں سنجیدہ ادب کا درجہ نہ دیا۔ سب سے مشہور کہانیاں ''الف لیلہ و لیلہ'' اور ''بدپائی کے قصے'' تھے، جو ہندوستان سے فارس اور وہاں سے عربی میں منتقل ہو کر چالیس زبانوں میں مقبول ہوئیں۔

(الف لیلہ ولیلہ کا قدیم عربی مخطوطہ)

ول ڈیورنٹ اس کی شہرت اس طریقے سے لکھتے ہیں:

Next to the Bible (itself Oriental), the Fables and the Nights are the most widely read books in the world[28]

ترجمہ:

"مشرق کی ہی بائبل کے بعد قصے اور 'الف لیلہ' دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتب ہیں"۔(بہر حال یہ کوئی حتمی رائے نہیں)۔

[28] Lbid،page 263

المسعودی نے ''مروج الذھب'' میں پہلی بار ''الف لیلہ'' کا ذکر کیا۔اس سلسلہ وار کہانی کا بنیادی ڈھانچہ ہندوستانی روایت سے لیا گیا۔یورپ میں یہ کہانیاں انٹوان گالان کے 1704ء کے فرانسیسی ترجمے کے بعد ہر زبان میں پڑھی جانے لگیں،

(الف لیلہ ولیلہ کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ)

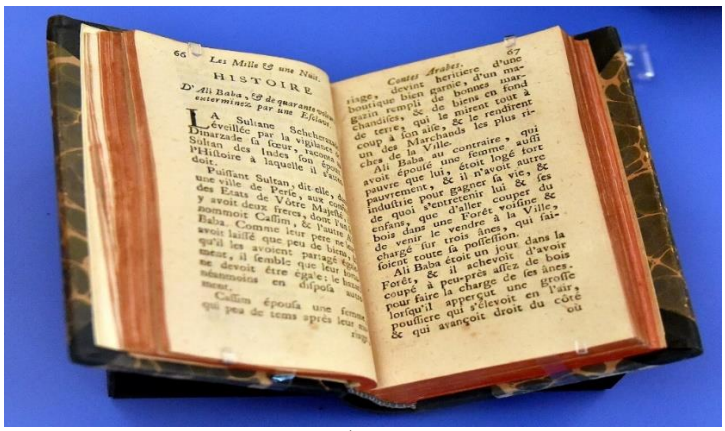

یہاں تک کہ سندباد، الہ دین اور علی بابا کے کردار عالمی داستانی ورثہ بن گئے۔

اسلامی دنیا میں نثری ادب بھی شاعری کی ایک صورت تھا۔ عرب مزاج میں زوردار احساس اور فارسی اطوار میں مرصع گفتار کا چلن تھا۔ بدیع الزمان ہمذانی نے ''مقامات'' اسی اسلوب میں لکھی۔ عربوں کا ذوق سمعی تھا؛ ادب نظم و نثر دونوں صورتوں میں بلند آواز سے سننے اور سنانے کے لیے لکھا جاتا تھا۔ شعر کی محفلیں خلیفہ سے لے کر عوام تک سب کے دل کا کھیل تھیں۔ شعرائے عرب مشکل قوافی اور نادر تشبیہوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔

شاعری کے موضوعات میں محبت اور جنگ کا غلبہ تھا۔ مذہبی مضامین پسِ پشت چلے گئے۔ عرب شاعری میں محبوب کی مشک بار زلفیں، انار جیسے ہونٹ اور چمکتی آنکھیں بار بار بیان ہوتیں۔

ابونواس اور المتنبی جیسے شعراء شہوانیت، شراب اور عشق کی شاعری میں ممتاز رہے۔ابو العلاء المعری جیسے فلسفیانہ مزاج کے شعراء نے مذہبی ظواہر پر تنقید کی اور زندگی کے تلخ حقائق پر روشنی ڈالی۔

بغداد ایک عظیم عالمی شہر

بہر حال خلافتِ عباسیہ کے عہدِ حکومت میں شہرِ بغداد میں ادبی، مذہبی اور فلسفیانہ نشستیں منعقد ہوتی تھیں جن میں مختلف عقائد کے لوگ خوش مزاجی اور رواداری سے گفتگو کرتے تھے، بغداد محض ایک دار الحکومت نہ تھا بلکہ یہ شہرِ علم و فن،

ادب اور سائنس کا گہوارہ تھا۔ مدارس، کتب خانے اور شاعری ہر سو رائج تھی۔ عام لوگوں کی زندگی کی تفصیلات محدود ہیں، مگر یہ طے ہے کہ انھوں نے اپنی محنت سے اس تہذیب کی بنیاد رکھی۔ وہ تہواروں اور شادی بیاہ میں شریک ہوتے، اور خلیفہ و مسجد کی شان و شوکت پر فخر کرتے۔ یوں پورا شہر اپنے وقت میں ایک عالمی سلطنت کا مرکز اور فخرِ عالم تھا۔

ماحصل کلام

غیر مسلم مستشرق و معروف مؤرخ ول ڈیورنٹ کے اقتباسات کی روشنی میں یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ خلافتِ عباسیہ وہ عظیم شاندار دورِ حکومت ہے جس کی افادیات کو بیان کرتے ہوئے عالمی شہرت یافتہ محققین بھی تعریف و تحسین کیے بغیر نہیں رہ سکتے،

خلافتِ عباسیہ کے وہ عہدِ ذریں ہے جس نے انسانیت کو علم و فضل، فلسفہ، سائنس، طب اور عظیم ادبی خزانوں سے ایسا مالامال کر دیا جس کے نتائج و ثمرات ہمیں دورِ حاضر کے ترقی یافتہ معاشروں میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں

جلد ۱، شمارہ ۵، ذوالحجہ ۱۴۴۶، جون 2025

ماہنامہ

بصیرتِ اسلام

موضوعات

- کائنات کی وسعت اور خالقِ کائنات کی حکمت
- تعارفِ کتب: قدس کو یہودی شہر بنانے کی کوشش
- مستشرقین کا تعارف، تاریخ اور اہداف (قسط دوم)
- روحانیت، الحادیت کا رد ہے!
- خلافتِ عباسیہ (مستشرق مؤرخ ول ڈیورنٹ کی نظر میں)

MUSLIM MATURIDIAN ORGANIZATION

پیش کش : مسلم ماتریدین آرگنائزیشن